Edited

سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیات اُردو شمارہ (۴۰)

شعرائے عثمانیہ

(یعنی)

مُرقعِ سخن کی چوتھی جلد

(جس میں)

جامعۂ عثمانیہ کے چھبیس شعراء کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے

(مُرتّبۂ)

سید معین الدین قریشی ایم اے (عثمانیہ)
صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ بھونگیر

عبدالقیوم خان باقی ایم اے ریسرچ اسکالر (عثمانیہ)
لکچرار اردو جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۹۳۹ء

ادارہ رفعت منزل۔ خیریت آباد سے شایع ہوئی

مطبوعہ مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس

دیباچۂ عمومی

مرقعِ سخن کی پہلی دو جلدوں کی اشاعت کے بعد سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل شعراء کے کلام کا انتخاب بھی اسی طرز پر پیش کیا جائے۔ چنانچہ دو سال پیشتر مولوی سید محمد صاحب لکچرار اردو سٹی کالج نے یہ کام اپنی نگرانی میں مولوی مہدی حسن صاحب (عثمانیہ) سے شروع کرا دیا تھا۔ بعد کو ادارۂ ادبیاتِ اردو کی خواہش پر یہ تمام مواد مولوی سید معین الدین صاحب قریشی اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی کے سپرد کر دیا گیا تاکہ یہ دونوں اصحاب اس پر نظرِ ثانی کریں اور جلد سے جلد اشاعت کے قابل بنائیں۔ اس نظرِ ثانی نے کام کی اصل اسکیم میں کچھ تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ہر شاعر کے حالاتِ زندگی سے متعلق پہلے جو نوٹ لکھے گئے تھے ان کی جگہ اب دوسرے نوٹ مرتب کیے گئے جن میں حالات کی جگہ خصوصیاتِ کلام پر زور دیا گیا ہے۔ ان نوٹس کی تیاری، کلام کے انتخاب، ترتیب اور ضروری مراسلت کا کام اگرچہ قریشی اور باقی صاحبان نے باہم اشتراکِ عمل کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن عملی طور پر باقی صاحب نے اس کی تکمیل میں خاص زحمت اٹھائی اور ابتدائی تقریب بھی انہی کی لکھی ہوئی ہے۔

اس مجموعہ کے لیے اگرچہ شعراء کے انتخاب میں معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ بعض ایسے شاعر رہ گئے ہوں جنھیں اس تذکرہ میں شریک کیا جا سکتا تھا۔ جو نظمیں شامل ہیں وہ زیادہ تر خود شعراء کی منتخب کی ہوئی ہیں۔ یا جن کی ترتیب میں مرتبین نے اپنے انتخاب کے ساتھ ان کی رائے کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ بعض شعراء مثلاً "وجد" برقی اور مخدوم وغیرہ نے خود ہی اپنے کلام کا پورا پورا انتخاب روانہ کیا اور ان کی خواہش کے مطابق مرتبین نے اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا اضافہ نہیں کیا ہے۔

ہر شاعر کے کلام میں سے اوسطاً دس نظمیں اور پانچ غزلیں پیش کی گئی ہیں تاکہ ہر ایک کے دل و دماغ اور خصوصیاتِ کلام کا کافی اندازہ ہو سکے نظموں اور غزلوں میں اگر کوئی مقام نظرِ ثانی کے محتاج تھے تو ان کو یا حذف کر دیا گیا ہے یا خود مصنف کی ذمہ داری

چھوڑ دیا گیا ہے ۔ البتہ کہیں کہیں طویل نظموں یا غزلوں کے اقتباس لینے میں مرتبین نے اپنے حق انتخاب سے کام لیا ہے ۔

اس مجموعہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کا کلام شامل ہے ۔ جن شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے اُن میں بعض مثلاً امیر، شمیم اور بیکش وغیرہ کے تو مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں مثلاً میر حسن الدین، رشدی، ڈاکٹر بدر اور اکبر وفا قانی وغیرہ جنھوں نے راقم الحروف کی طرح اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے شعر گوئی کم کر دی یا چھوڑ دی ہے لیکن شاعر کی حیثیت یا تخلص کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔ یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ طیلسانیین یا عثمانیہ کے طلبۂ قدیم کے ساتھ ساتھ دو عثمانی خواتین کو بھی اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے اور چونکہ دو ایک شعراء نے اپنا کلام دیر سے روانہ کیا اس لیے افسوس ہے کہ حروفِ تہجی کی ترتیب باقی نہ رہ سکی ۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کی تقریب میں لکھا گیا ہے ایک قسم کی ادبی یادداشت ہے اور اس میں کافی گنجائش ہے کہ بعد میں کام کرنے والے دوسرے اڈیشن میں اضافہ کریں ۔ یہ سلسلہ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ جاری رہیگا ۔ نئے شاعر پیدا ہوتے رہینگے اور شعرائے عثمانیہ کا نام قائم رکھینگے ۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی خواہش تھی کہ اس مجموعہ میں جملہ شعراء ایک جگہ نظر آسکیں چنانچہ اسی خیال سے ۲ رجب ۱۳۵۸ھ کو ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا اور سب کو تاریخ مقررہ سے بہت قبل ہی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ۔ اس اہتمام کے باوجود افسوس ہے کہ بعض شعراء شریک نہ ہو سکے ۔ اس لیے مجبوراً انہی اصحاب کا گروپ فوٹو شریک کر دیا گیا جنھوں نے شرکت کی زحمت گوارہ کی ۔

سید محی الدین قادری زور

یکم آذر ۱۳۴۹ ف

تقریب

جامعۂ عثمانیہ کو قائم ہوئے تقریباً پچیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اِس مدت میں فرزندانِ جامعہ نے جو کچھ علمی خدمتیں انجام دیں وہ مختلف ذریعوں سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ لیکن اس امر کی بھی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ جامعہ کے فارغ التحصیل شاعروں کے کلام کا ایک مختصر انتخاب شائع کیا جائے تاکہ شعری دنیا میں ان کی کوششوں کا ایک اجتماعی اندازہ ہو سکے۔ اس مجموعے کو جو سامنے ہے کسی قسم کی خود نمائی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ عثمانی شعرا کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ منتخب کلام کی ایک ادبی یادداشت اور شیرازہ بندی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے متعلق بارہا کہا جاچکا ہے کہ اس نے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیکر جدتِ فکر و نظر کی سوتیں سی کھول دیں۔ جدتِ فکر کا ایک اندازہ شعر و سخن کے مطالعے کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس روشنی میں اگر آپ ہمارے شاعروں کا کلام کسی قدر ہمدردی کے ساتھ دیکھینگے تو یہ محسوس ہوگا کہ آپ ایک ایسی قوم کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں جو عہدِ اضطراب میں زبان اور ادب کی بدلنے والی قوتوں کے ساتھ جنگ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ قوم پورے طور پر ان قوتوں سے ہم آہنگ بھی نہیں ہونا چاہتی بلکہ اُن کے درمیان اپنا ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وہ کوشش ہے جو آپ عثمانیہ شاعری میں سب سے پہلے شامل اور داخل پائینگے، اور اپنے انداز میں لکھنے اور سوچنے کی شاید یہی وہ صلاحیت ہے جس نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو جامعہ کی شعری پیداوار کا ایک انتخاب شائع کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

جہانتک عثمانی شعرا کی نظر اور علم و خیال کا تعلق ہے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی ذہنی دولت علومِ قدیم اور جدید کے ایک اتحاد سے پیدا ہوئی ہے، اور اسی دولت کا طفیل ہے کہ وہ جدید آرٹ اور لٹریچر کے بعض پہلوؤں کو علم اور شعر کی روشنی میں لانے کے قابل ہو سکے۔ انھیں موقعہ ملا کہ وہ قدرت اور اس کے حُسن سے متعلق، جیسے انھوں نے دیکھا،

سوچا اور محسوس کیا ہے کچھ لکھیں۔ وہ حُبِ وطن اور ذوقِ تاریخ کے اس جذبے کو نمایاں کر سکے جو ہر عثمانیہ کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔ وہ کچھ اپنے گیت بھی گا سکے جس میں محبت، حُسن اور غم کی کہانی تھی۔ اس ترنگ میں جہاں ہو سکا انہوں نے تقلیدی قوت کو اپنے آپ پر مسلط نہیں ہونے دیا، اور بڑے شاعروں کے کلام اور جادو کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس ذہنی دباؤ کا مقابلہ کیا جو عام طور پر سوچنے والے دماغ پر پڑتا اور تازہ ادب پیدا کرنے میں سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں آپ شاید یہ بھی محسوس کریں کہ جن شاعروں کا کلام آپ پڑھ رہے ہیں وہ شباب کی ایسی ذہنی قوتوں کی آغوش میں ہیں جو اپنی آتشیں رفتار میں زندگی کے بعض تاریک پہلوؤں سے دب نہیں جاتیں۔ ان نوجوانوں میں آپ شعری رسائی کی وہ سرد، تجربہ کارانہ اور محتاط طرزِ ادا نہیں دیکھینگے جسے بزرگانِ قوم فخر اور کامیابی کے ساتھ شعری فنکاری کا آلہ بناتے ہیں۔ یہاں آپ کو جذباتِ شباب کا ایک ہیجان اور بڑھتی ہوئی اُمنگوں کا ایک جوش نظر آئے گا۔

ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ ان نغمہ سرایوں کا شعری سرمایہ مختلف موضوعات اور طرزِ سخن گوئی پر مبنی ہے، لیکن اس کے پس پردہ آپ کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ یہ ایک ہی ماحول کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں اور اُن کے گیتوں میں تقریباً ایک ہی رُوح جاری و ساری ہے۔

یہ ہم آہنگی ادب کی دنیا میں شاید ایک قسم کا امتیاز متصور ہو اور مجموعہ ہذا کے پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تنوعِ خیال کے ساتھ ساتھ ذوقِ سخن کی ہم رنگی بھی منظرِ عام پر آجائے۔ ایک طرف ہر شاعر کے تعارف میں اسکی نظمیں اور اُن پر نوٹ ہیں، دوسری طرف انکا مجموعی کلام ہے۔ اب ناظر پر موقوف ہے کہ وہ اس شعری سنگم کا بھی لطف اٹھائے جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے اور ان چشموں کو بھی دیکھے جو مختلف سمتوں سے آ کر ایک جگہ ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آرام ۔ قاضی غلام احمد شریف

[خوش خیال، ہنسنے ہنسانے والے انسان، لیکن اس ہنسی کے پیچھے ایک چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے ہیں۔ دنیا کی قدامت پر نظر ہے، جذبات مذہبی رنگ سے رنگین، خیالات مذہب کی روحانی فضا میں مدہوش، کلام میں پختگی کے آثار ہیں، بے تکلف لکھتے ہیں اور جہاں انکا قلم زندگی کے گہرے تار چھیڑتا ہے لطف آجاتا ہے۔ ہر صنفِ سخن میں مشق رکھتے ہیں۔ غزل، نظم اور رباعی ان کے خاص میدان ہیں۔ "فریبِ ہستی" اور "گھڑی" میں آرام نے دلوں پر اچھی چوٹ لگائی ہے]

فریبِ ہستی

ارمان ہائے دل کے مقابل ہے جانِ زار
دنیائے کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے

دستِ جفا سے دامنِ حسرت ہے تار تار
منزل گہہ سکوں کہیں تیرا پتہ بھی ہے؟

جب دل ہی دل میں اپنے تمنا رہے کوئی
جانِ حزیں کو وقفِ مصیبت ہی جان لیں

تاچند رنجِ دوریٔ مقصد سہے کوئی
تدبیر پر اڑیں کہ مقدر کو مان لیں

نومیدیاں ہیں روز یہ مدنظر ہے وصل
ناکامیاں ہیں اور تمنائے جستجو

پھل لائے یا نہ لائے کسی دوستی کا نخل
وہ سخت جاں ہوس ہے کہ چھوڑے نہ آرزو

لگ جائے ہاتھ جس کے درِ گنجِ بیکسی
پھر وہ غلام کیوں ہو کسی احتیاج کا

بارِ وجود بھی ہے محبت کا بوجھ بھی
انسان غم کا بندہ ہے یا تخت و تاج کا؟

دُرِّ خوشی ہے گم سرِ گردابِ زندگی
تدبیر ہے اسیر مقدر کے جال میں

اُمید ہے حرارتِ سیمابِ زندگی
پوشیدہ ہے سکونِ غمِ لازوال میں

ہم مست تھے درِ کنجِ عدم ہمکو تھا بہشت
لائی ہیں خود نمائیاں کیوں بامِ دید پر

باتوں میں غم کی بھول گئے ساری سرگذشت
پھر اب جو خوشی کو یاد کریں کس اُمید پر؟

حسنِ ادا فریب کی صورت سرابِ دہر
دورِ جہان میں بھی ہے کچھ آسماں کی چال

سربستہ کیا معمہ ہے یہ انقلابِ دہر
کھلتا نہیں ہے زیست کی نیرنگیوں کا حال

کیا ہو سلوکِ ہستیٔ ناکام کا گِلہ
اس کے سبب کہیں کے بھی یارب نہیں رہے

آرام، ماسوا سے نہ پائے گا تو صلہ
کیوں آستانِ غیر پہ تیری جبیں رہے؟

چراغ

سورج غروب ہو کے جو کچھ دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

تاروں کی چھاؤں سے بھی ہیں کیا فائدہ اُٹھاؤں؟
یہ تو وہ وقت ہے کہ نہ دے ساتھ اپنی چھاؤں

آمد ہے ایسے وقت میں تیری خوش آمدی
مانندِ صبحِ عید ہے تیری برآمدی

میرے اندھیرے گھر کے اُجالے رفیقِ شب
بختِ سیاہ چشمِ منور ترے سبب

دیوار و در کی شان تری روشنی سے ہے
روشن مرا جہان تری روشنی سے ہے

روشن ہو تو جہاں کوئی ظلمت نہ آ سکے
صورت نہ اپنی کوئی سیہ رُو دکھا سکے

تجھ سے ہر اک اکیلے کا دل باغ باغ ہو
محفل کو کون پوچھے جو وہ بے چراغ ہو

گم کردہ راہ کے لئے تو خضرِ راہ ہے
بستی کے حال چال کا سچا گواہ ہے

تو ہے نظامِ شمسی کے جیسا کوئی نظام
اہلِ نظر کا ہے جو ترے گرد اژدہام

ہر طرح تو نے رات کو بھی دن بنا دیا
اعجازِ آفتاب کی صورت دکھا دیا

دوسرا رخ

اے شکلِ دلنواز، ضیابخش، نور پاش !
میری نظر کو تیری حقیقت کی ہے تلاش

یہ جلوہ یہ جمال کہاں سے ملا تجھے؟
یہ حُسن یہ کمال کہاں سے ملا تجھے؟

اپنی زبان ہی سے سنا اپنی واردات
کس طرح پائی شعلہ رخی، گرمیٔ حیات

پوشیدہ راز کیا ہے نمایاں ہے جس سے تو؟
قوت وہ کونسی ہے فروزاں ہے جس سے تو؟

کیا تو بھی اِک وَلی ہے کہ روشن ہے جس کا قلب
روشن نگاہ جس کی چراغِ ثبوت و سلب

تو بھی کسی کے عشق میں جلتا ہے رات بھر
ہے محوِ یاد تو بھی کسی بُت کا تا سحر

ہے خاکِ پائے دوست سے تیرا خمیر بھی
تو ہے ہوائے وصل سے روشن ضمیر بھی

سوزِ دروں بھی تجھ میں ہے موجود گریہ بھی
ہے امتزاجِ نور سے تیری بھی زندگی

تو جانے کس حبیب سے لگایا ہوا ہے لَو
برقِ نظر سے ملتی ہے تجھ کو حیاتِ نو

شمعِ ازل کی یاد کا سامان تجھ میں ہے
سوز و گدازِ عشق کا طوفان تجھ میں ہے

ہے آفتابِ حُسنِ حقیقی کی تو مثال
جس میں جَلال بھی ہے سراپردۂ جمال

بیدار جلوہ ہو گئیں خوابیدہ خوبیاں
کہیے کہ ذات اپنی صفت میں ہوئی عیاں

تو ایسی نار ہے کہ تیرا سایہ نُور ہے
ہر آن نور و نار کا تجھ سے ظہور ہے

میں تجھ کو سمجھوں عارضِ پُرنور حُور کا
یا شاہدِ جمال تجلّیٔ طور کا

پروانہ چمکا تیری محبت کے داغ سے
گویا چراغ ہوگیا روشن چراغ سے

اے پیکرِ جمالِ حقیقی کہاں ہے تو
اتنا تو جانتا ہوں کہ جانِ جہاں ہے تو

ہر ذرہ آفتاب ہے تیرے ہی نور سے
ہر قلب کائنات ہے تیرے ظہور سے

اس پر بھی میرے سینے کا مٹتا نہیں ہے داغ
بے تیرے جلوہ کے مری ہستی ہے بے چراغ

ہر چند آفتاب ہے بے پردہ جلوہ گر
تابِ نظارہ لا نہیں سکتی ہر اِک نظر

دے نور سے فروغ جلا دل کو نار سے
اپنا بنا کے رکھ مجھے ہر اعتبار سے!

گھڑی اور اسکی بیداری

وابستہ تری جان ہے کس جانِ جہاں سے
اِنسان کا دِل آ گیا پہلو میں کہاں سے

کیا زندہ دلی پائی ہے تو نے بھی کہ ہر دم
ہے ایک ہی رفتار ترا ایک ہی عالم

میدانِ مسطح پہ کوئی سیلِ رواں ہے
جو پیرِ متانت میں ہے چستی میں جواں ہے

مستانہ روش ایسی کہ اک جھومتا ہاتھی
یا چھیڑ ہے یکتارہ کے رنگین نوا کی

ہے موج کہ جھونکا ہے صبا کا کوئی پیہم
یا نبض جوانوں کی جو ہے رقص میں ہر دم

بے تابی پہ تیری تجھے سیماب کہوں میں
یا عشق زدوں کا دلِ بے تاب کہوں میں

ہر ایک کو ہے تیری صدا سامعہ افروز
بے پاؤں کے چلنا ترا سب کو سبق آموز

ہے نظمِ عمل تجھ میں چڑھی تیری کماں ہے
وابستہ ترے وقت سے کارِ دو جہاں ہے،

محفل ہو کوئی گرم کہ تنہائی کا عالم
تو وقت پہ ہر ایک کی ہے مونس و ہمدم

بیدار کوئی ہو کہ نہ ہو تو تو ہے بیدار — اوروں کو بھی بیدار بنانے میں نگہدار
ہر لحظہ فرائض کی ادائی میں ہے سرشار — اپنی ہی تگ و تاز میں سرگرم لگاتار
پابندیٔ اوقات کا ساماں تجھے وافر — منزل پہ پہنچ کر بھی کمر بستہ مسافر

دنیا میں اسی طرح ہر انساں گزارے — کانٹوں پہ بھی آرام سے گزران گزارے
رکجائے تو رکجائے جو چل جائے تو چل جائے — جو دل میں ہو منہ سے بھی وہی صاف نکل جائے
منزل پہ بھی سستی کبھی ہو جائے نہ صادر — اتنا تو ارادوں میں رہے آدمی قادر!

دوسرا رخ

ہاں کتنی ہے مرغوبِ طبیعت تری لے بھی — کیا شیشۂ دل میں ہے ترے عشق کی مے بھی!
یہ تیری تڑپ تیری حقیقت کا سراپا — ہر تیری کشش عشق و محبت کا خلاصا
ہے اسمِ حقیقی کے تجھے ذکر کا چسکا — جو کام ہے تیرا نہیں ہر ایک کے بس کا
دن رات اسی ذکر سے ہے تجھ کو سروکار — ممکن نہیں ٹوٹے کبھی از خود یہ ترا تار
بیدار ہو کوئی کہ نہ ہو اس کی نہیں فکر — دنیا ہوئی غافل ترا چھوٹا نہ کبھی ذکر
دھن تیری بڑے وجد کا سامانِ دل آویز — ہر ضرب تری توسنِ دل کے لئے مہمیز
صحبت تری غافل کو بھی بیدار بنادے — اسرارِ حقیقت کا طلبگار بنادے
ہے جذب و سلوک ایسا تری بزمِ طرب میں — ہویت کی صدا گونجتی ہے گوشِ طلب میں
دم سے ترے ہے تارِ نفس میرا ہم آہنگ — وہ بزم بھلی جس میں کہ ہوں جمع سب یکرنگ

دم سے ترے آتا ہے سبق بھولا ہوا یاد — معلوم ہوا دونوں کی ہے ایک ہی بنیاد
مقصد بھی ہے اک دونوں کا مقصود بھی ہے ایک — دونوں کے دلوں میں وہی موجود بھی ہے ایک

اے دل کی گھڑی کیوں نہ تجھے بھی میں دکھالوں — کچھ صاف کرادوں تجھے اور وقت ملالوں
رکنا یہ بگڑنا ہے ترا ایک قیامت — بے وقتوں کو ہر طرح کی ہوتی ہے ندامت
بیکار نہ جائے نفسِ سافل و عالی — تجھ سے نہ رہے جیب مرے سینہ کا خالی
ہیں کان تو ہر وقت ترا ساز سنوں میں — دھیمی سے بھی دھیمی تری آواز سنوں میں!

یارانِ رفتہ کی یاد میں

نہ پوچھ اے ہم نفس بربادیٔ دل کا سبب ہم سے — کہ فرصت بات کرنے کی نہیں ہے سعیٔ پیہم سے
پتہ شاید چلے سوزِ نہاں کا دردِ پیہم سے — سکوتِ لب سے، آہِ سرد سے، یا چشمِ پرنم سے
تڑپ سے نبضِ جاں کی، یا دھڑکتے دل کے ماتم سے

سکوتِ زندگی اک پل میں جب وقفِ تلاطم ہو — نہ پھر کیوں موجِ طوفانی گلِ تر کا تبسم ہو
سرِ گردابِ غم جب مطمئن دل کی خوشی گم ہو — شبِ دیجور سے بڑھ کر فضائے بزمِ انجم ہو
گھٹا چھاتی ہے ابرِ تیرہ کی، دردِ تبِ غم سے

محبت ہے وہ گل، پہلو میں جس کے خارِ فرقت ہے — محبت اک نہ اک دن موجبِ رنج و مصیبت ہے
بچھڑنا دوست کا طرفہ قضا ہے، مرگِ حسرت ہے — تمناؤں کی دنیا کا اجڑ جانا قیامت ہے
یہ چنگاری ہے وہ جو کم نہیں سوزِ جہنم سے

ہراساں یوں تو ہر اک ناقص و کامل سے ملتا ہے — ہزاروں ملنے والوں میں کوئی اک، دل سے ملتا ہے

جسے کہتے ہیں مخلص دوست وہ مشکل سے ملتا ہے — یہی گم ہو تو کیا فریادِ لاحاصل سے ملتا ہے
جگر کا زخم بھرتا ہے کہاں آہوں کے مرہم سے؟

بھلا دیتا ہے صدہا لطف اک سوزِ غمِ پنہاں — مٹا دیتی ہے بس اک ٹیس دل کی ان گنت خوشیاں
کبھی ہوتا ہے وجہ رنج ہر اک عیش کا ساماں — کبھی گریاں بنا کر چھوڑ دیتا ہے دلِ خنداں
کبھی بیکار ہو جاتا ہے جینا ایک ہی غم سے

ہنسی ممکن، مگر ہر بات پر رونا نہیں آتا — خوشی سے کوئی دنیا میں کسی کا غم نہیں کھاتا
نہ ہو دل خون جب تک، اشک رنگِ خوں نہیں لاتا — جو غم ہو جان لیوا، جان لے کر بھی نہیں جاتا
جگر کی آگ کچھ ہوتی ہے ٹھنڈی اشک پیہم سے

خوشی کیا صاحبِ زر کو ملی دولت پہ گر دولت — مگر کم مایہ لٹ جائے تو ہے جائے غم و حسرت
بجھے شمعِ فروزاں، جب بھی اُس کی منزل راحت — مگر ہے اہلِ محفل کے لئے اندھیر کی صورت
جگر چھلنی ہے کن داغوں سے کیوں پوچھے کوئی ہم سے

رُباعیات

دل عرضِ طلب کا متمنّی ہے ضرور — لیکن کہیں اظہار نہ بن جائے قصور
ہے جرأتِ موسوی مری حالتِ زار — اے مرکزِ نور رونما پھر جلوۂ طور

ہر رُوپ میں ہے جلوہ نما حُسن و جمال — ہر رنگ میں ہے کرشمہ زا دولت و مال
لیکن ہے یہ سب تجلّیٔ شانِ ظہور — صانع کی صفت ہی تو ہے صنعت کا کمال

کونین کے جلوے میں ضیا کس کی ہے؟ قدرت جزو کل میں رونما کس کی ہے؟
یہ بھی جو تری مدح نہیں ہے مولا توصیف میں ہر شے کی ثنا کس کی ہے؟

تخلیق کی جاں اور وہ ممدوح ہیں آپ جو مظہر قدوس ہیں سبوح ہیں آپ
ہے آیۂ لَوْلَاکَ کی تفسیر یہی ہر پیکر ہستی کے لئے رُوح ہیں آپ

ممکن کہ ہوں زردار خجستہ فرجام ہے بات جو بے زر کا بھی ہو نیک انجام
نادار بھی، بے زباں بھی، تشنہ بھی ہیں دیکھیں ہمیں ساقی کوئی کیونکر دے جام

دنیا ہے مُرید، مال ہے تو سب کچھ خِلقت ہے فدا، جمال ہے تو سب کچھ
دونوں بھی نہ ہوں، تو سیکھے اِنساں کمال انسان میں کچھ کمال ہے، تو سب کچھ

اللہ نے دی ہے جنھیں اپنی نعمت کچھ خرچ سے گھٹتی نہیں ایسی دولت
قسمت والے کو دینے والے داتا دینا تو مجھے کہ میں ہوں اک بے قسمت

مانا کہ وہی ہیں منزلت والوں میں ہے جن کا شمار معرفت والوں میں
میری تو ہے عرض چشمِ ساقی سے یہی رہنے دو مجھے دید کے متوالوں میں

اسد طلبی ہے مری ہستی کی ترنگ — لیکن نہ جمی ہنوز کیری کی رنگ
اے دل کے مکیں، دل کو بنائے ایسا — جو قصرِ محبت کا ہو بنیادی سنگ

لبریز نہ ہو دل کا یہ کاسا کبتک؟ — اُمید کی صورت ہو دلاسا کبتک؟
آرام کوئی تشنہ لبی کی حد بھی — یارب لبِ دریا ہوں پیاسا کبتک؟

غزل

سوادِ دل کو نگیں دل کی آرزو نے کیا — ادھر جو بزم میں رُخ بے نقاب تو نے کیا
کسی کو کچھ بھی خبر تھی نہ میری حالت کی — سلوک مجھ سے یہ میری ہی گفتگو نے کیا
شمارِ ظلم! کہ لکھ کر تو کچھ رکھا ہی نہیں — کیا کچھ آپ نے، کچھ چرخِ کینہ جو نے کیا
کیا تلاش اسے اور سب کو کھو بیٹھا — عجیب کام ہماری ہی جستجو نے کیا
یہ شوخیاں بھی کوئی شوخیاں ہیں او ظالم — منایا ہم نے تو انکار اور تو نے کیا
تباہ دیکھا اسے جس میں خوبیاں دیکھیں — کیا جو پھولوں کو برباد رنگ و بو نے کیا
یہاں یقین کہ ہم بے قصور ہیں ابتک — وہاں یہ ضد ہے کہ جو کچھ کیا سو تو نے کیا

بگاڑیوں تو مقدّر کا تھا مگر آرام
خراب تجھ کو ترے لطفِ آرزو نے کیا

اشک ۔ محمّد جلال الدین ۔ بی اے ۔ ال ال بی (عثمانیہ)

[تخلص کی طرح مزاج بھی نرم و نازک پایا ہے ۔ فطرت کے انمول خزانوں سے لطافت اور حُسن کے موتی چُننے پھرتے ہیں ۔ نظمیں کیا ہیں حریم فطرت کی رنگین آوازیں ہیں ۔ ان آوازوں کو سُنو اور ان تصورات میں گم ہو جاؤ جو ان کے قریب ہیں ۔ درد اور احساس ان کی زندگی ہے ۔ جس طرح پھول کو قدرت کی ایک لاڈلی سمجھتے ہیں اسی طرح بعض وقت انسان کو بھی ایک نازک چیز سمجھ کے آنسو بہاتے ہیں ۔ قوم ان کے نزدیک قدرت کا ایک کھلونا ہے اللہ میاں کی بستی میں وہ کبھی شک اور کبھی عقیدت کے پھول لئے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، یقین نہیں ہوتا کہ کس منزل پر یہ راز کھلتا اور کیا پیغام سناتا ہے ۔ سلطانہ رضیہ، برسات، گوند شہزادہ اور نغمۂ رنگین میں اشک کے دل کی آواز خوب اثر کر رہی ہے ۔]

فطرت اور زندگی

ابرِ سیاہ فام سے تاریک تھی فضا ۔۔۔ جھکڑ تھے تیز و تند ہوائے شمال کے
زہرہ تھا آب آب کڑک سُن کے رعد کی ۔۔۔ گم ہو گئے تھے ہوش ہمائے خیال کے
پانی کا زور و شور غضب کا بلا کا تھا ۔۔۔ ٹکڑے سے اڑ رہے تھے رِدائے جلال کے
البتہ برق نور فگن تھی کبھی کبھی ۔۔۔ ظلمت دکھا رہی تھی کرشمے جمال کے

فطرت دکھا رہی ہے تماشائے زندگی
کرغور تا کہ تجھ کو نظر آئے زندگی

دنیا فضا ہے ابرِ سیہ نامرادیاں
جھکڑ یہ تیز و تند نہیں آہِ سرد ہے
یہ رعد کی کڑک ہے صدا انقلاب کی
عزمِ ثبات جس کے مقابل میں گرد ہے
مینہ کا وفور دیدۂ تر کا ہے جوشِ اشک
لمعانِ برق عشق و محبت کا درد ہے

نغمہ

زخمۂ تارِ ربابِ ہستی
موجۂ بادۂ کیف و مستی
شورشِ فتنۂ محشر تجھ میں
تابشِ روئے ستمگر تجھ میں
بحرِ ہستی میں ہے طوفاں تیرا
طور رہتا ہے فروزاں تیرا
لذتِ سوزِ دروں ہے تجھ سے
دلِ مضطر میں سکوں ہے تجھ سے
سازِ الفت میں ترنم تجھ سے
باغِ عالم میں تبسم تجھ سے
غنچے کھلتے ہیں صدا سے تیری
طور جلتے ہیں ندا سے تیری
گوہرِ اشک صلہ ہے تیرا
شاہ بھی ایک گدا ہے تیرا
آہ! خاموشِ جہاں ہو جس دم
ظلمتِ شب میں نہاں ہو جس دم
ہائے اسوقت تراکیفِ وجود
دردمندوں کا ہے تنہا مقصود
روحِ انساں میں ساری تو ہے
آیۂ رحمتِ باری تو ہے

تو نہ ہوتا تو جہاں تھا یہ خراب
گوہرِ اشک نہ ہوتے نایاب

تیتری

ساحتِ گوشۂ گلشن میں پرافشاں میں ہوں　　مایۂ نازِ چمن رُوحِ گلستاں میں ہوں
موجۂ رنگ ہوں گلزار بداماں میں ہوں　　چشمۂ نور کی اِک موجِ درخشاں میں ہوں
دم قدم سے مرے گلشن میں بہار آئی ہے
حسنِ رنگیں کو مرے دعوئے یکتائی ہے

دوش پر بادِ صبا کے میں اُڑا کرتی ہوں　　خم کے خم بادۂ فطرت کے پیا کرتی ہوں
منہ کو غنچوں کے کبھی چوم لیا کرتی ہوں　　نالۂ بلبلِ شیدا بھی سُنا کرتی ہوں
حسنِ فطرت کا کرشمہ ہے یہ ہستی میری
کتنی پرکیف ہے گلزار پرستی میری

صبحدم جب کہ شعاعوں سے ہو زرپاش فضا　　نکہتِ گل سے گرانبار ہوں امواجِ صبا
نونہالانِ چمن جھوم رہے ہوں ہر جا　　چہچہوں کا ہو پرندوں کے بھی اِک شور مچا
کوئی اسوقت مرا جلوۂ رقصاں دیکھے
گل و گلزار کو انگشت بدنداں دیکھے

فتنۂ خوابیدہ سے

اے رشکِ قمر رشکِ حسینانِ جہاں اُٹھ　　اے روشنیٔ دیدۂ صاحب نظراں اُٹھ
اے باعثِ ہنگامۂ آشفتہ سراں اُٹھ　　اے مایۂ بیتابیٔ خونیں جگراں اُٹھ

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

ہشیار ہو اب رنگ بدلنے کو ہے عالم — اٹھ دیکھ نظر آنے لگا نیّرِ اعظم
پھیلا ہوا کرنوں کا زمانہ پہ ہے پرچم — ہاں رات کی وہ بزم ہوئی درہم و برہم

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

سونے کا نہیں وقت یہ اے سروِ خراماں — کیوں بند کئے لیتا ہے تو نرگسِ فتّاں
اٹھ اٹھ کہ چمکنے لگا خورشیدِ درخشاں — اٹھ اٹھ کہ منوّر ہوئے گلزار و بیاباں

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

نظمِ رنگیں

[ذیل کی نظم میں ایک حسین دوشیزہ کے اوّلین تاثراتِ محبت کو پیش کیا گیا ہے۔ اشک]

وہ بلاتے ہیں میں انکار کروں یا نہ کروں — سوچتی ہوں کہ انھیں پیار کروں یا نہ کروں
دیکھتے ہیں وہ مرے گیسوئے پیچاں کی طرف — اِن کمندوں میں گرفتار کروں یا نہ کروں
نیم بسمل ہیں ابھی کیوں نہ بنادوں بسمل — تیغِ ابرو کے ادھر وار کروں یا نہ کروں
نذر کرتے ہیں مجھے قلبِ پُرارماں اپنا — ناوکِ ناز کو دوسار کروں یا نہ کروں
آزماؤں نہ کیوں اب حسن کا جادو اے دِل — نگہِ چشم فسوں کار کروں یا نہ کروں
غمزۂ ابروئے خمدار کروں یا نہ کروں — عشوۂ نرگسِ بیمار کروں یا نہ کروں

رات دن آتشِ فرقت میں جلا کرتی ہوں / حال سے اِن کو خبردار کروں یا نہ کروں
ضبط کی تاب نہیں اب دلِ مضطر میں مرے / آج اِک آہِ شرربار کروں یا نہ کروں
اشک امنڈے ہی چلے آتے ہیں طوفان آگیں / دیدۂ تر کو گہربار کروں یا نہ کروں
دامنِ صبر مرا چاک ہوا جاتا ہے / ان کی الفت کا میں اقرار کروں یا نہ کروں
سوچتی ہوں کہ انھیں پیار کروں یا نہ کروں / جذبۂ عشق کا اظہار کروں یا نہ کروں

گونڈ شہزادہ

[میری رائے میں گونڈوں کی قوم ایک ایسی قوم ہے جو صدہا سال سے ہر قسم کی تہذیبوں کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کر رہی ہے۔ ذیل کی نظم میں بیک ٹو نیچر کا تخیل کارفرما ہے۔ اشک]

قلبِ آزاد نہیں قیدیٔ بندِ تہذیب / کبھی پائیگا نہ تجھ کو یہ سمندِ تہذیب
دور رہنا ہے بہت تجھ سے گزندِ تہذیب / نہ تو تہذیب پسند اور نہ پسندِ تہذیب
تیری توصیف میں خامہ کو جو جولاں کر دوں
سارے تہذیب کے دفتر کو پریشاں کر دوں

کوہ تیرے ہیں ترا دشت ہے صحرا تیرا / ندیاں تیری ہیں نالے ترے دریا تیرا
رودِ گنگا میں نہاں آئینہ خانہ تیرا / چار سو عالمِ فطرت میں ہے چرچا تیرا
شیر بھی کانپتے ہیں بانگِ درا سے تیری
چیتے گھبراتے ہیں دلدوز صدا سے تیری

ہے یہ زنجیرۂ کہسار ترا حصنِ حصیں / قلۂ کوہ پہ ہوتا ہے تو اورنگ نشیں
سامنے تیرے درختوں کا ہے حسنِ رنگیں / اور بچھائے ہے گنگا بھی ردائے سیمیں

تیری تقدیر میں فطرت کی شہنشاہی ہے
ساری دنیا تری مصروفِ ہوا خواہی ہے

شاد رہ شاد رہ اے نازشِ نوعِ انساں — تیری دنیا میں نہیں مکر و دغا کا ساماں
تو ہے آزاد نہیں قیدیٔ تہذیب جہاں — حسن میں تیرے جھلکتا ہے جمالِ یزداں

اپنی عظمت کو خدا کے لئے برباد نہ کر
یعنی تہذیب کا کوئی بھی سبق یاد نہ کر

نظیر اکبر آبادی

زندگی تھی تری بجلی کی طرح سے بیتاب — ترے پہلو میں نہاں دل تھا مثالِ سیماب
تری آنکھوں سے ٹپکتا تھا جگر کا خوناب — ترے ہونٹوں پہ برستا تھا مسرت کا سحاب

کبھی گلشن ترا بربادِ خزاں ہوتا تھا
کبھی ویرانہ ترا رشکِ جناں ہوتا تھا

کبھی جنگل میں پھرا عاشقِ لیلیٰ بن کر — کبھی گلشن میں رہا بلبلِ شیدا بن کر
شررِ طور کو دیکھا کبھی موسےٰ بن کر — کبھی افتادہ رہا نقشِ کفِ پا بن کر

ہم نے اس شان کا کوئی نہ قلندر دیکھا
دلِ مضطر کو ترے مثلِ سمندر دیکھا

تو ہی تھا ایک یہاں محرمِ رازِ فطرت — مرتعش تھا ترے مضراب سے سازِ فطرت
تو ہی آواز میں تھا سوز و گدازِ فطرت — نازمیں تیرے تھا پوشیدہ نیازِ فطرت

حبّذا پردۂ فطرت کے اٹھانے والے
مرحبا چیر کے دِل اپنا دکھانے والے

سُلطانہ رضیہ میدانِ جنگ میں

آخری لڑائی

ہاتھ میں تیر کماں اور کمر میں تلوار — دوش پر زلفِ سیہ گوش میں دُرِّ شہوار
زیر ران اسپِ شبکیر و صرصر رفتار — تمتمائے ہوئے گرمی سے وہ دونوں رخسار
آج میدان میں رضیہ کی سپہ داری ہے
کچھ انوکھی یہ زمانہ سے طرحداری ہے

گرد آلودہ جبیں ہونٹوں پہ آہِ سوزاں — اثرِ رنج و الم دیدۂ گریاں سے عیاں
دولتِ حسن پہ اپنے جو کبھی تھی نازاں — آج میدان میں آئی ہے وہ نالاں گریاں
پیچ تقدیر کا ہے گیسوئے پرپیچ اسے
کام دنیا کے نظر آتے ہیں سب ہیچ اسے

آہ بگڑی نظر آتی ہے زمانہ کی ہوا — اپنی ہی فوج کے سردار ہیں سرگرمِ جفا
کل وفادار تھے جو آج وہ دیتے ہیں دغا — لُٹ رہی ہے سرِ بازار جہاں جنسِ وفا
ظلمتِ یاس کی چھائی ہیں گھٹائیں سر پر
کس غضب کی ہوئی نازل ہیں بلائیں سر پر

یاس انگیز زمانہ کی ہے حالت کیسی — آنکھ جھپکاتے پلٹ جاتی ہے قسمت کیسی
سر پہ رضیہ کے ہے آئی ہوئی آفت کیسی — اس کی صورت سے عیاں آج ہے حسرت کیسی

جو وفادار تھے غدّار نظر آتے ہیں
تختِ شاہی کے طلبگار نظر آتے ہیں

برسات کی رات

کتنا پرشور ہے دریا کا تلاطم یارب
کتنی تاریک ہے جنگل میں یہ برسات کی رات
بادِ صرصر کے چلے آتے ہیں جھونکے کیسے
ڈر ہے خاموش نہ ہو جائے مری شمعِ حیات
ظلمتِ ابر نے معدوم کیا ہے سب کو
نہ فلک پر ہیں ستارے نہ زمیں پر ذرّات
گل رنگیں بھی سیہ پوش ہوئے ہیں افسوس
آج بدلے نظر آتے ہیں چمن کے حالات
اک اندھیرے میں ہیں پوشیدہ ازل اور ابد
نہ زمیں ہے نہ زماں ہے نہ جہت ہے نہ جہات
ظلمتِ یاس میں پوشیدہ ہوئی ہے امید
اک کرن بھی نظر آتی نہیں اب تو ہیہات
اتنا مایوس نہ ہو اے دلِ بے تاب و تواں
کچھ ہمیشہ تو رہے گی نہیں برسات کی رات
دیکھ! جگنو وہ چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
دیکھ بجلی وہ دکھاتی ہے زمیں کے ذرّات
دیکھ! ہاں دیکھ! ذرا غور سے مشرق کی طرف
صبحِ صادق کے نظر آتے ہیں شاید جلوات
کیا تعجب ہے کہ خورشید جہاں تاب اپنا
ہو نمودار کرے چاک ردائے ظلمات

مادرِ گیتی

ماخوذ از شیلے

اے مادرِ گیتی ترے دامانِ کرم میں
کیا بیش بہا گوہر و یاقوت بھرے ہیں
تو مظہرِ جبروتِ جلالِ ازلی ہے
کہسار و سمندر ترے قدموں پہ پڑے ہیں

اشجار جو پھیلے ہوئے ہیں حدِّ نظر تک
ہے فیض یہ تیرا ہی کہ اس طرح کھڑے ہیں
یہ سارے زمانہ کے نوا سنج پرندے
تیرے ہی اشارے سے ہواؤں میں اڑے ہیں

تو خالقِ اشکال ہے تو نورِ ازل ہے
ہر شئے سے نمودار ترا ذوقِ عمل ہے

انساں کے لئے مادرِ گیتی ترا آغوش
گہوارہ مسرّت کا ہے خوشیوں کی فضا ہے
گو تاک میں رہتی ہے اجل اس کے ہمیشہ
پر ہاتھ میں تھامے ہوئے تو آبِ بقا ہے
تو پالتی ہے اس کو بہاروں کی ہوا میں
پہناتی اسے شوق سے پھولوں کی قبا ہے
یہ فیض ہے تیرا ہی کہ انسان کا گھر آج
دولت سے تری روکشِ فردوس بنا ہے

سرشار فضاؤں میں تری جلوہ گری ہے
تو قوتِ تخلیق کی جادو نظری ہے

ہیں کھیل رہے وسعتِ صحرا میں ہزاروں
انسانوں کے بچے کہ جو ہیں حسن کے تارے
دوشیزہ حسینوں کے بھی ہیں غول یہاں پر
پانی کے لئے آئے ہیں ندی کے کنارے
کھیتوں میں کوئی بانسری بیٹھا ہے بجاتے
کیا دلکش و رنگیں ہیں یہ جنگل کے نظارے
ہے حسن بھی اور عشق بھی معصوم فضا میں
ہیں چاروں طرف اڑتے محبت کے شرارے

اے مادرِ گیتی یہ ترا فیضِ اثر ہے
یاں خار بھی گلزار کا منظورِ نظر ہے

غزلیں

شعلوں میں خود کو یوں نہ چھپایا کرے کوئی
خونِ شفق سے جلوہ دکھایا کرے کوئی

آنکھیں بچھی ہیں انجمِ تاباں کی ہر طرف
گلگشت کے لئے کبھی آیا کرے کوئی

اتنا بھی شوقِ عرش نشینی نہیں ہے خوب
اِس وسعتِ جہاں میں سمایا کرے کوئی

ابرِ سیہ میں برق کی رخشندگی عبث
پردہ کبھی تو رخ سے اٹھایا کرے کوئی

مدت سے فتنہ بار ہے یہ عقل فتنہ کوش
اب دستگیریٔ دلِ شیدا کرے کوئی

تاریکیوں میں راحتِ عالم ہوئی ہے گم
مشرق سے آفتاب کو پیدا کرے کوئی

صحنِ چمن کی وسعتِ محدود سے ہوں تنگ
اے کاش! اس کو دامنِ صحرا کرے کوئی

جی چاہتا ہے بارشِ بارانِ حسن سے
اِس آبجوئے چشم کو دریا کرے کوئی

اے اشکؔ قصۂ غمِ الفت نہ چھیڑنا
ایسا نہ ہو کہ تجکو بھی رسوا کرے کوئی

آسمانوں کی طرف مائلِ پرواز ہے دل
اِک ستارے کی طرح محوِ تگ و تاز ہے دل

دونوں عالم میں ہے اِک حشرِ ترنم برپا
زخمۂ سازِ ازل بن کے نوا ساز ہے دل

کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے حقیقت دل کی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا راز ہے دل

کہیں مجنوں کے بیاباں میں ہے خاکِ کفِ پا
کہیں منصور کی سولی پہ سرافراز ہے دل

کتنی دلچسپ ہے دنیا میں کہانی دل کی
کشتۂ ناز ہے دل کشتۂ انداز ہے دل

منتظر کس گلِ رنگیں کا یہ ہوگا اے اشکؔ
آج اِس کیف سے جو زمزمہ پرداز ہے دل

بل کھائی ہوئی زلفِ معنبر کو ذرا دیکھ
شرمائی ہوئی نرگسِ شہلا کی ادا دیکھ

ہاں اے نگہ شوق وہ اب جیبں بہ جبیں ہیں
ترکش سے نکلنے نہ لگیں تیرِ قضا دیکھ

گلزارِ محبت کی ہو گلگشت مبارک
کہتی ہے ترے کان میں یہ بادِ صبا دیکھ

الٹا دے نقابِ رخِ زیبا کو گھڑی بھر
ہے کس دلِ صد چاک میں اک حشر بپا دیکھ

اے دیدۂ مشتاق نظر ڈال سنبھل کر
ذرّوں میں چمکتا ہے وہ خورشید لقا دیکھ

پھولوں سے ہنیں روکشِ فردوس یہ عالم
پھیلے ہوئے ہر سو ہیں وہ نقشِ کفِ پا دیکھ

ہاتھوں میں لئے بادۂ گلرنگ کے ساغر
کس شان سے آتا ہے محبت کا خدا دیکھ

خونابۂ دل دردِ جدائی میں بہا کر
اے اشک ذرا اشکِ محبت کا مزا دیکھ

اکبر وفاقانی

سید محمد۔ بی۔ اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

[جو الاکمی شاعر ہے۔ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کیا ہے ادب کو آرٹ سے جو نسبت ہے وہی نسبت اکبر کو نظم سے ہے۔ یہ دنیا میں اداکار بن کے رہنا چاہتے ہیں، اپنے دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے، ان کا شعر بھی آرٹ کا ایک راز ہے۔ جدت کے پرستار ہیں اور ترنم کے دلدادہ، اس لئے نپی تلی بحروں میں اپنے آپ کو قید کرنا نہیں چاہتے۔ زبان کو خیال کا رنگ سمجھتے ہیں، مصور نے جو رنگ مناسب سمجھا دیدیا۔ ہندی ترنم اور تشبیہات کا استعمال ان کا مسلک رہ چکا ہے۔ بہ حیثیت جوہری کے ان کی دکان کھلی نہ تھی کہ یہ وکالت کی دنیا میں اُلجھ کر شعر سے علحدہ ہو گئے]

تاج محل کو دُور سے دیکھ کر

اک خواب کی دُنیا کو کھڑا دیکھ رہا ہوں
میں دہر میں تعبیرِ فنا دیکھ رہا ہوں

وہ گنبد و محراب وہ مینار نگینہ
جوں محوِ تبسّم کوئی خوابیدہ حسینہ

یوں دُور درختوں سے یہ جلوہ نظر آیا
بادل سے کوئی چاند نکلتا نظر آیا

ہر شئے متناسب کوئی گوہر کی لڑی ہے
اک حور ہے جو مرمری جامے میں کھڑی ہے

ہر قبہ چمکتا ہوا ہیرے کی کنی ہے
یہ ہند کا احرامِ زلیخا بدنی ہے

دوشیزۂ اقبالِ سلاطیں کہیں اس کو
تیمور کی اولاد کی انگلیں کہیں اُس کو

گنبد ہے کہ یہ لحنتِ دلِ شاہجہاں ہے
جو اپنی تمنّا کے لئے خود نگراں ہے

بُتِ کمسن

اے نور کی پُتلی روحِ حیا — اے حورِ بہشتی کی ہمتا
اک کیف تری گفتار میں ہے — اک وجد تری رفتار میں ہے
پیمانہ تیری آنکھیں ہیں — میخانہ تیری آنکھیں ہیں
تو ننھی بھولی بھالی ہے — تو کالے کاکل والی ہے
شاعر کے دل کی آہ ہے تو — عاشق کا عزّوجاہ ہے تو
تصویرِ تبسّم تو ہی ہے — اور جانِ تکلّم تو ہی ہے
تو حور ہے یا گلشن کی پری — یا حسن کی مے شیشہ میں بھری
زلفوں میں کرن کا ہے جلوہ — زربفت ہے نور و ظلمت کا
گالوں میں جانِ گلاب بھری — آنکھوں میں روحِ شراب بھری
واں آنکھ میں پتلی کالی ہے — یاں دل سے پہلو خالی ہے
کیا الّڑھ پن کی باتیں ہیں — کیا بھولے پن کی گھاتیں ہیں
کیا سادہ اور پرکار ہے تو — انجان ہے اور عیّار ہے تو
کانوں میں تاگے کے ڈورے — دل صدقے ایسے زیور کے
چہرے پہ بلا کی معصومی — ہے تجھ میں خدا کی معصومی
شوخی و شرارت بھولا پن — بچپن میں جوانی کا جوبن

عاشق کے دل کو چور کرے | جو وار کرے بھر پور کرے
آ میرے دل کو مست بنا | بے کل ہوں مستِ الست بنا
اس دنیا سے بیزار ہوں میں | ان جھگڑوں سے ناچار ہوں میں
ہوں خاکسترِ اس گلشن میں | بے بال و پر اس گلشن میں
بلبل ہوں اور گل کا جویا | بیمار ہوں سنبل کا جویا
گمنامی کا پیغام ہوں میں | یعنی کہ شکستہ جام ہوں میں
الفت کا ٹوٹا ساز ہوں میں | بسمل کے دل کا راز ہوں میں
متوالے کا اک راگ ہوں میں | پتھر میں چمکتی آگ ہوں میں
ناکام مری خاموشی ہے | بدنام مری سرگوشی ہے

تو مجھ کو بے پایاں کردے
اور الفت کے شایاں کردے

ساغرِ جہانگیر

اے جہانگیر اے حسین عاشق | کون ہے تجھ سا مہ جبین عاشق
تیرا پیمانہ میرے سامنے ہے | اک پری خانہ میرے سامنے ہے
تھی بہشتِ نظر تری محفل | روحِ شاعر تھی یا تری منزل
تیرا گھر تھا کہ حسن کا گلزار | شعلہ رویوں کے بانکپن کی بہار
بن گیا تھا زمیں پہ باغِ جناں | جمع تھیں اک جہاں کی حوریں یہاں
ہند کی ایک تھی حسین پری | جس کی آنکھیں سیاہ جادو بھری

ترک و ایراں کی خوش ادائی تھی   گویا خیّام کی رباعی تھی
باغ کی وہ روش وہ گل کاری   نسلِ تیمور کی طرحداری
حوض میں روحِ آب فوارے   بہشت دالان کے وہ نظارے
وہ صراحی میں کیفِ عشرت بند   دلِ عاشق میں جیسے حسرت بند
چنگ و بربط پہ شعر خوانی تھی   ہر صدا میں بھری جوانی تھی
بہرویں تھی کبھی بہار کی چھیڑ   خلشِ زخمِ دل ستار کی چھیڑ
نازنینوں کا رقص تھا چھم چھم   جیسے جل پر پھوار ہو رم جھم
سب پہ طرفہ کسی کی آمد تھی   نورِ محفل تھا یا قیامت تھی
مست آنکھوں میں اک تبسّم تھا   یا تڑپتا ہوا ترنّم تھا
ہاتھ میں اک صراحی مئے تھی   اور ہونٹوں پہ بے صدا لے تھی
ایک رنگیں ایاغ تھامے ہوئے   یا دلوں کا چراغ تھامے ہوئے
حسن بیں آنکھ کو یہ دعوت تھی   نہ پیے اب بھی تو قیامت تھی
اے جہانگیر تیری رنگینی   تھی بہارِ جناں کی گل چینی
رندیاں تجھ سا کون آئے گا   ہند کو پھر حسیں بنائے گا
اب بھی باقی ہے تیرا پیمانہ   دیکھ کر جس کو دل ہے دیوانہ

سامنے اس کے خون روتا ہے
یادِ ماضی پہ جان کھوتا ہے

حسن کی دیوی

نفیس ملبوسِ مرمریں میں کھڑی ہوئی اک حسین شئے ہے
دلوں کے حق میں سکوں مجسم نظر کے حق میں لطیف مے ہے

یہ حسن کاری کی جان شاعر کے دل سے پیدا ہوئی ہے گویا
حسین خالق کی آرزو شکل آذری میں چھپی ہے گویا

شباب کا جوش کمسنی کی شرارتوں سے نکھر گیا ہے
جو زلف بل کھا کے رک گئی ہے تو محرمِ ناز ابھر گیا ہے

وہ بانکا سج دھج وہ تیکھی چتون ادائے دلکش ہے شکل پیاری
کہ اپنی حالت میں مست کوئی کھڑی ہے یونان کی کنواری

غضب ہے ایسا حسین منظر اور ایسے پتھر کی سادگی میں!
ہزار رنگوں کا اک مرقع چھپا ہے مرمر کی سادگی میں!

آغازِ شباب

جس طرح سرما میں ہو امرود گدرایا ہوا
جس طرح گرما میں ہو آموں کا بن چھایا ہوا

جس طرح نارنج ہوں باغوں میں شعلہ پیرہن
جس طرح ہو سیب سرخ و سبز اور نازک بدن

ہے یوں ہی اے جانِ جاں تیری اداؤں کی بہار
کیوں جوانی پھر نہ ہو تیرے لڑکپن پر نثار

وہ صباحت میں ملاحت کی جھلک جادو بھری
جوں شفق کے رنگ پر چادر ہو ہلکے ابر کی

آنکھ میں معصوم ہرنی کی ادا سوئی ہوئی
جس طرح ہو یاسمن شبنم سے مُنہ دھوئی ہوئی

پتلیاں تیری سیاہی میں جوابِ طور ہیں
کیا غضب ہے اس قدر ظلمت میں بھی پُرنور ہیں

تیری آنکھوں سے شعاعِ بے گناہی جلوہ گر
جس کے نظارے نے روشن کردیئے داغِ جگر

رَس بھری آواز تیری نغمۂ داؤد ہے
جس کے زیر و بم میں میرے دل کی ہست و بود ہے

قہقہہ کی گونج تیری قلقلِ مینا میں ہے
ربِ ارنی کی صدا اس طورِ بے سینا میں ہے

ماہ کی تنویر ہے تالاب کے رُخ پر جبیں
رقص کرنوں کا فرازِ کوہ پر ہے دل نشیں

صبح کی شبنم ایاغِ گل سے مئے آشام ہے
آسماں کے میکدے میں لطفِ صبح و شام ہے

تیرے نظارے میں لیکن محو ہو جاتا ہوں میں
حُسن کے معصوم منظر میں خدا پاتا ہوں میں

آواز قدم

سرِ راہ آوازِ پا ہر طرف سے
کوئی آرہی ہے کوئی جارہی ہے

اک آواز میں جستجوئے طلب ہے
اک آواز مستی کو شرما رہی ہے

اک آواز میں کیفِ مستی ہے ظاہر
مگر جام سے مئے چھلک جارہی ہے

اک آواز ہے التجائے گداگر
اک آواز نخوت کو ٹھکرا رہی ہے

اک آواز ہے دوسری کی طلب میں
صدا جس کی رُک رُک کے بڑھ جارہی ہے

صدا یوں تو ہے سیکڑوں ہی قدم کی
مگر ایک سے اک جدا آرہی ہے

اک آواز میں ہچکیاں ہیں مسلسل — خوشی کی کوئی راگنی گا رہی ہے
مگر در مرا وا ہے آمد پہ جس کی
وہ آواز آنے میں شرما رہی ہے

گاؤں والی

حسین چشمۂ آب روانِ صحرائی — کہ مرغزار میں جس کی ہے بادہ پیمائی
یہ تیری محنت و خوبی کی اک نشانی ہے — تری بہار کا صدقہ مری جوانی ہے
شکوہِ دہر سے نا آشنا نظر تیری — فضائے بے خبری میں ہوئی بسر تیری
مگر وہ جذب ہے تیرے خرامِ نازک میں — کہ جس کو قوتِ کون و مکاں نہ روک سکیں
تو اپنی راہ تبسم پہ جادہ پیما ہے — تری اداؤں پہ قربان بزمِ امکاں ہے
ترے خرام سے سبزہ میں جان پیدا ہے — ترے سکوں سے سکونِ سحر ہویدا ہے
ترے ہی دم سے ہے رحمت خدا بر تر کی — ترے قدم سے بڑھیں رونقیں بے گھر گھر کی
شمیم پاک ہے تو مثلِ چشمۂ صحرا — ہے عکس جس میں جمالِ کمال خوبی کا

سُندر شام

مہرِ مسافر کوہ کے پیچھے دھیمے دھیمے جاتا ہے — اور اندھیرا ساری فضا پر ڈرتے ڈرتے چھاتا ہے
شام شفق پہ چھا جاتی ہے جیسے جوانی بچپن پر — موسم گل میں مست گھٹا چھاتی ہے جیسے گل بن پر
جیسے دلہن رُخ سے اپنے آنچل سرخ ہٹاتی ہے — لے کر اک انگڑائی ظالم دھیرے دھیرے آتی ہے
یوں ہی سندر شام پیاری، آتے آتے آتی ہے — دنیا کو سکھ چین دکھاتی، عاشق کو تڑپاتی ہے

تارے قصر و بامِ فلک پر آ کے چمکنے لگتے ہیں
آنسو جیسے میری پلک پر آ کے ڈھلکنے لگتے ہیں

شام کے ناٹک میں یہ تارے ناچ دکھانے آتے ہیں
بزمِ جہاں کو دیکھ کے شاید خود ہی سہمے جاتے ہیں

چڑیاں گاتی شور مچاتی آ کے بسیرا لیتی ہیں
اور تھکی ماندی دنیا کو مژدۂ راحت دیتی ہیں

اودے اودے کہساروں پر ظلمت چھاتی جاتی ہے
رات کی ناگن کرنوں کو چن چن کر کھاتی جاتی ہے

رات اور دن کے ملنے میں کیوں شورِ قیامت اٹھتا ہے
شام کے سندر ہاتھوں سے کیوں دن کا جوبن لٹتا ہے

شام کے سینے میں بھی شاید بات فنا کی ملتی ہے
زیست اور موت کے ہنگاموں میں اسکی جوانی پلتی ہے

سورج چھپ جانے سے اختر بامِ فلک پر چڑھتے ہیں
اور وقتِ سحر شاید وہ فلک سے مرجھا کر گر پڑتے ہیں

یوں ہی اس دنیا کے تارے حسن کے زینے چڑھتے ہیں
اپنے پیا کو دیکھ کے سب شرما کر مدھم پڑتے ہیں

ٹیپو سلطان سے اہلِ ہند کا خطاب

اے پیکرِ آزادی اے روحِ شجاعت آ
اے قلبِ محبت آ، اے جانِ حمیت آ

ایثار و صداقت پر کی جان فدا تو نے
دکھلا دے اسیروں کو اجڑی ہوئی شوکت آ

قائم تھا ترے دم سے اندازِ جہانبانی
باقی تھی ترے بل پر حریتِ انسانی

آ دیکھ! تری کھیتی برباد ہوئی کیونکر
اس باغ پہ گلچیں کی بیداد ہوئی کیونکر

تھے دل کے جو ہنگامے وہ گل کی طرح چپ ہیں
بے سود تری بلبل، فریاد ہوئی کیونکر

نالوں میں عنادل کے وہ جان نہیں باقی
اور گل کے تبسم میں وہ آن نہیں باقی

ہم دوست عدو کے ہیں اور دوست کے دشمن ہیں
غیروں کے تو رہبر ہیں اپنوں ہی کے رہزن ہیں
منجدھار میں آفت کے ہیں اہلِ وطن سارے
ہے غم کی گھٹا سر پہ برباد نشیمن ہیں

اے روحِ عمل ٹیپو آ ہم کو سہارا دے
آفت کے اٹھانے کا اس قلب کو یارا دے

آ، اور ہر اک گل میں بو ہو کے سما جا تو
غنچوں کو کھلا جا تو، سوتوں کو جگا جا تو
پروانہ بنا جا تو اس دیس کی الفت کا
اس بزمِ محبت میں اک شمع جلا جا تو

حیدر کے پسر آجا اور خون بہا کر جا
اے شیرِ نیستانی باطل کو مٹا کر جا

ٹیپو تری ہستی پر نازاں ہے وطن اب تک
اور تیری شہادت پر نالاں ہے وطن اب تک
محفل تری سونی ہے اور جانِ عمل گم ہے
اک جان نہ ہونے سے بیجان ہے وطن اب تک

آنکھوں میں چمک جا تو آنسو سے ٹپک جا تو
الفت کی انی بن کر ہر دل میں کھٹک جا تو

وہ بھی کوئی جلوہ تھا جو طور پہ رہ جاتا
یا شیخ کا تقویٰ تھا جو حور پہ رہ جاتا
ٹیپو کا دلِ مسلم کونین کا حامل تھا
کس طرح یہ ممکن تھا میسور پہ رہ جاتا

دنیا بھی ملی اس کو عقبیٰ کی حکومت بھی
اک وار میں حاصل کی شہرت بھی شہادت بھی!

نیا پل اور شام

شام کی سُندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ، ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پُر بہا
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

ایک جانب ہے عدالت[1]، اک طرف دار الشفا[2]
دُور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دار الکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کے آب و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رُودِ موسیٰ پر نیا پل، دہر کی تصویر ہے
جس کی دورنگی میں دونوں دور کی تعبیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہے کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

---

[1] عدالت العالیہ۔ [2] دواخانہ عثمانیہ۔ [3] سٹی کالج۔ [4] کتب خانہ آصفیہ۔

امیر — محمد امیر بی اے (عثمانیہ) بی ٹی (علیگ)

[مذاق سخن نکھرا ہوا اور صاف ستھری زبان رکھتے ہیں۔ ان کی نغمہ سرائی میں اُپج اور جدت کا ظہور ہے، لفظوں سے ترنم پیدا کرنا ان کا کمال ہے تخیل کے ساتھ جذبے کی ایک کشمکش پائی جاتی ہے جہاں جیت اکثر تخیل کی ہوتی ہے ایک زمانہ میں ان کی طبیعت میں زور تھا، اب مزاج مائل بہ افسردگی نظر آتا ہے۔ ان کے دل کی واردات سے ان کے کلام میں اثر پیدا ہوتا جا رہا ہے ترجمے کے اچھے مشاق ہیں، مغربی شاعروں کی بعض نظموں کو خوبی کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا ہے جن میں شیب و شباب اور حیات جاوید قابل داد ہیں]

محسوسات

ترے تبسم کی اک جھلک ہے جسے میں جنت سمجھ رہا ہوں
تری نگاہِ عتاب ہے وہ جسے قیامت سمجھ رہا ہوں

ہزار سانچوں میں حسن مشیت نے مجھ کو ڈھالا بدل بدل کر
اُسی مشیت کا خواب ہوں میں جسے حقیقت سمجھ رہا ہوں

رموز تیرے کبھی نہ سمجھوں اگر جو سمجھوں تو ہو قیامت
میں اپنی نادانیوں کو سرمایۂ بصیرت سمجھ رہا ہوں

نمود نے مجھ کو نیستی سے نکال کر الجھنوں میں ڈالا
خودی کو اپنی کبھی فسانہ کبھی حقیقت سمجھ رہا ہوں

اُسی نشیمن کی خاک ہوں میں گری تھی برقِ عتاب جس پر
میں اپنے ذرّوں کی بزم کثرت کو شانِ وحدت سمجھ رہا ہوں

کبھی خدائی سے ہوں میں روشن کبھی ہوں تاریک بندگی سے
میں نور و ظلمت کو پیکرِ آب و گل کی زینت سمجھ رہا ہوں

بچّہ

بچہ نہیں تارا ہے اِک چاند کا ٹکڑا ہے
بڑھتا ہوا شعلا ہے

اک نور ہے سرتاپا اک طور ہے چھوٹا سا
اک ساز ہے قدرت کا اک راز ہے فطرت کا
اک پھول ہے جنّت کا

خورشید کی چمکوں میں مہتاب کی جھلکوں میں
گلزار کی مہکوں میں

ہے جسم ڈھلا اُس کا چہرہ بھی ہے کندن سا
آنکھیں بھی ہیں کیری سی اور زلف ہے چھوٹی سی
اک جان ہے ننھی سی

بچّے کا جو ہنسنا ہے پھولوں کا وہ جھڑنا ہے
تاروں کا وہ کھلنا ہے

ضو ہے مہ انور کی اک موج ہے کوثر کی
یا برق ہے اِک چمکی

اک شور ہیں بچّوں کے جو تار ہیں نغموں کے
وہ لحن ہیں چڑیوں کے

پائے نہیں جاتے ہیں	دل کو نہیں بھاتے ہیں
پر اُن کو جو چھیڑیں ہم	سب دور ہوں رنج و غم
کلفت بھی ہو ساری کم

شیب و شباب

(براؤننگ کی مشہور نظم ربی بن عذرا کے ترجمے سے انتخاب کیا گیا)

میری طرح تمھیں بھی بڑھاپا نصیب ہو	آئے تمھاری عمر میں بھی شامِ زندگی
حاصل تمھاری زیست کا آغاز میں نہیں	تم کو ابھی ہے دیکھنا انجامِ زندگی
کل تک اڑائے بادۂ گلرنگ کے مزے	پینا ہے آج دُردِ مئے جامِ زندگی

دورِ شباب کے ہیں مزے یاد آج تک	گم تھے مرے حواس خدا کے کمال میں
نیرنگیاں جہاں کی لبھاتی تھیں دل مرا	کھویا ہوا سا رہتا تھا حسن و جمال میں
جو گوشِ ہوش نے سنا، دیکھا جو آنکھ نے	ہیں قید آج تک مرے دامِ خیال میں

اے ربِ ذوالجلال تری حمد کیا کروں	خالق ہے بے نیاز ہے اور ہے کریم تو
دیکھی تھی میں نے عہدِ جوانی میں قدرتیں	اب دیکھتا ہوں لطف و کرم تیرا چار سو
دھو ڈال اپنے ہاتھ سے ہستی کا آئینہ	ہے تیرے موقلم کی مجھے کب سے جستجو

اہلِ جہاں کو صرف نمائش سے ہے غرض	مقصد کی رفعتوں پہ کسی کی نہیں نظر
پروا نہیں جو حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں	اور پورے ہو سکے نہ تخیل بلند تر

مشکور ہو سکیں نہ اگر کوششیں تو کیا | غم کیا ہے! اگر نہ مل سکا مقصود کا گہر
یزداں کی رحمتوں سے نہیں نا امید میں | وہ میرے قول اور عمل سے ہے باخبر
اُس کو پسند ہے مری نازک خیالیاں | اُس کی نظر میں کلام مرا ہے عزیز تر

بھرتا ہوں اب میں بادۂ ہستی سے جامِ گل | لاتا ہوں تیرے پاس کہ کرلے قبول تو
اے ساقیٔ ازل یہ تری ہی شراب ہے | پیدا ہے موج موج سے تیرا ہی رنگ و بو
گر تو لگا دے اپنا لبِ سرمدی اسے | تکمیلِ زندگی کی نکل جائے آرزو

خط کا انتظار

روز و شب رہتا ہے مجھ کو ان کے خط کا انتظار | کس طرح بہلاؤں دل کو کس طرح پاؤں قرار؟
در پہ باندھے ٹکٹکی میں دیکھتی ہوں بار بار | پاس میرے آج شاید آئے گا پیغامِ یار
پا کے آہٹ نامہ بر کی کچھ سکوں پاتی ہوں میں
اک حیاتِ نو مجھے ملتی ہے کھل جاتی ہوں میں

دور ہوتی ہے تڑپ کافور ہو جاتی ہے یاس | دیکھتی ہوں شوق کی نظروں سے اپنے آس پاس
نامہ کیا آیا کہ گویا آ گئے وہ میرے پاس | بھول جاتی ہوں مسرت سے بدلتی ہوں لباس
پڑھتی رہتی ہوں میں پہروں انت کچھ کھلتا نہیں
درد و غم کی داستاں بھی ختم ہوتی ہے کہیں؟

خط کو آنکھوں سے لگا کر چومتی ہوں دم بہ دم
تا کہ قلبِ مضطرب کی ساری بیتابی ہو کم
تولتی ہوں حرف سارے عشق کی میزان میں
اور سمو لیتی ہوں ان کا حُسن اپنی جان میں

عظمتِ پیری

دھارے پہ تیرتی تھی مری کشتیٔ حیات
دریائے زندگی میں بلا کا تھا اضطراب
بادِ بہار دوڑتی پھرتی تھی چار سُو
اک آگ لگ رہی تھی گلوں میں کنارِ آب
گلشن میں شاخسار پہ طائر تھے نغمہ زن
آرام کی تھی سُدھ، نہ ہمیں تھا خیالِ خواب

تیزی سے جا رہی تھی مری کشتیٔ حیات
یا جا رہا تھا مجھ کو لیئے سیلِ خواہشات
فرصت نہ تھی کہ دہر کا کرتا نظارہ میں
اور دل کی وسعتوں میں سمو لیتا کائنات

اب ختم ہو گئی ہے جوانی کی کشمکش
اب پا چکا ہوں ساحلِ دریائے زندگی
سنتے ہیں گوش نغمۂ رنگیں جہان کے
لیتی ہے شمعِ رُوح ستاروں سے روشنی
(ٹیگور)

حیاتِ جاوید

[یہ ورڈسورتھ کی مشہور نظم ODE TO IMMORTALITY کے مکمل ترجمے کا انتخاب ہے۔]

اے مرے ننھے سے بچے! جسمِ ظاہر یہ ترا
وسعتِ دل کا ذرا دیتا نہیں کچھ بھی نشاں
اے کہ تو ہے فلسفی، نکتہ شناس و رمز بیں
تیری فطرت دورِ ماضی کی ہے اک ارثِ گراں

گو بہ ظاہر تو ہے ناداں اور ہے بالکل خموش   پر نگاہوں میں ہیں تیری یہ زمین و آسماں

روح تیری ہے پیاماتِ الٰہی کی امیں   ہے ترے مُرغِ تخیّل کا فلک پر آشیاں

تو ہے وہ پیغام بر روشن ہے جس کی چشمِ دل   تجھ پہ آئینہ ہیں سب رازِ حیاتِ جاوداں

راز ایسے جن سے اہلِ عقل ہیں نا آشنا   اور حل کرنے سے ہیں مجبور جن کو نکتہ داں

دہر کے ظلمت کدے میں سب کے سب محصور ہیں   جس کی ظلمت پر لحد کی تیرگی کا ہے گماں

اے کہ تجھ پر سایہ افگن ہے حیاتِ لازوال   جیسے قدرت ہے زمیں پرتوِ مہرِ زماں

تیری عظمت ہے مسلّم تیرا رتبہ ہے سوا   گرچہ ہے تو خلق کی نظروں میں اک ننھی سی جاں

تیرا بچپن زندگانی کا ہے دورِ شاندار   جس سے وابستہ تری آزادیوں کا ہے جہاں

پھر یہ کیوں غور و تردّد، یہ تلاش و جستجو   کس لئے ہو فکرِ فردا باعثِ آزارِ جاں

ہو گئیں طفلی کی خوشیاں نذرِ علم و آگہی   رُوح پر آلامِ ہستی کا ہے اک بارِ گراں

ڈالنی ہے پاؤں میں بیڑی رواج و رسم کی
دیکھنی ہنگامہ آرائی ہے بزم و رزم کی

ماضی و حال

آ بتاؤں تجھ کو اے غافل طریقِ بندگی   تا ہو تجھ پر مدعائے خلقِ آدم آشکار

چونک اب خوابِ گراں سے دیکھ آنکھیں کھول کر   ہو گئی جنت تری دورِ خزاں سے ہم کنار

یہ زمین و آسماں، یہ آفتاب و ماہتاب   ہیں تری شمشیر کی خونریزیوں کے سوگوار

اٹھ محبّت کی طلب میں دے پیامِ آشتی   اک محبّت ہی یہ تیری زندگی کا ہے مدار

ہاں مہک کر پھیل جا آفاق میں گل کی طرح   مَست کر دے محفلِ ہستی مئے مُل کی طرح

خطائے گل

کہا مٹی نے اِک دن تھام کر دامن مشیت کا — زباں کٹتی ہے کچھ انداز ایسا ہے حکایت کا
نہیں غم آسمانوں کی بلندی سے اترنے کا — نہیں کوئی تردد اپنے ذرّوں کے بکھرنے کا
وطن کی قید سے چھوٹی تو رفعت بڑھ گئی میری — یہ آئی خلد سے باہر تو قیمت بڑھ گئی میری
بہارِ بے خزاں سے ہو گیا تھا دل مرا بیزار — کھٹکتا تھا مری آنکھوں میں کانٹے کی طرح گلزار
نہ گرمیٔ عمل تھی واں نہ کچھ ہنگامہ آرائی — سکون و عیش کی مدہوشیاں تھیں ہر طرف چھائی
غرض وہ راگ کی اور رنگ کی اک زندگانی تھی — مقدر کو سلانے کے لئے رنگیں کہانی تھی

مرے خوابوں نے آخر لی جو اک ہلکی سی انگڑائی — حقیقت کی نئی دنیا نظر کے سامنے آئی
اڑا طاعت کے پھندوں سے مجھے ذوقِ گنہ لیکر — خریدی میں نے آزادی حیاتِ جاوداں دیکر
پڑا تھا منہ لپیٹے یہ جہاں ظلمت کی چادر میں — کہ جیسے طفلکِ نازائیدہ ہو بطنِ مادر میں
ابھی تقدیر کی زلفیں سلجھنے سے الجھتی تھیں — ابھی تخلیق کی کلیاں تبسم سے جھجکتی تھیں
ابھی تھا قطرۂ گوہر کے دل میں قطرۂ باطل — ابھی کھلنے نہ پائے تھے زمیں کے جوہر قابل
نہ ٹوٹا تھا تدبّر سے طلسم رنگ و بو اب تک — بھٹکتی پھر رہی تھی بحر و بر میں جستجو اب تک

ہزاروں سال میں لڑتی رہی اپنے مقدر سے — بگڑتی اور جھگڑتی ہی رہی اپنے عناصر سے
ڈھلتی جاتی تھی جو ہمت بندھی آہستہ آہستہ — تھمی جاتی تھی جو ندی چڑھی آہستہ آہستہ
سجایا میرے ہاتھوں نے تماشا گاہِ قدرت کو — بسایا میری ہمت نے جہانِ نو کی وسعت کو

مجھے بھی یاد ہیں وہ ساعتیں وہ ناز کی باتیں — کہ بزمِ قدس میں کچھ ہو رہی تھیں راز کی باتیں

ترے تیور سمجھ کر ہٹ گئے سب نوری و ناری
ترے انداز پاکر کائناتیں ڈر گئیں ساری

جھکی تیری نگاہ پاس تو اتری مرے دل میں
خطا آگے بڑھی اور بڑھ کے رکھ لی بات محفل میں

یہی تیری مشیت تھی کہ بن جاؤں تماشا میں
یہی تیرا تصور تھا کہ ہو جاؤں نظارا میں

بڑھا رتبہ خطا کا جب دو عالم کی نمائش میں!
تو پھر ہستی مری کیوں مبتلا ہے آزمائش میں؟

بلائیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں میرے آشیانے کو
تڑپتی پھر رہی ہیں بجلیاں خرمن جلانے کو

پھٹی آخر وہ ڈالی جان تھی جو شاخساروں کی
اسی تنکے کو تاکا آن تھی جو لالہ زاروں کی

بلندی کا نشاں اب بھی مری پستی میں باقی ہے
شرر امید کا خاکستر ہستی میں باقی ہے

بکھر کے تیرے قدموں میں پڑی ہوں یہ سمٹ جاؤں
شرار ناتواں ہوں بڑھ کے شعلوں سے لپٹ جاؤں

یونہی بھٹی میں جل جل کے زر کامل بنوں گی میں
بنوں گی تو تیرے تخلیق کا حاصل بنوں گی میں

غزلیں

اک تبسم میں مرے گلشن کھلیں تقدیر کے
اک نگاہ قہر میں خرمن جلیں تدبیر کے

ہوں عیاں جوہر تمھارے ناخن تدبیر کے
گر نکالو بل مری الجھی ہوی تقدیر کے

اے جنوں سوز محبت میں اثر اتنا تو ہو
خود بخود جائیں پگھل حلقے مری زنجیر کے

طور روشن جلووں سے کیونکر بچے اپنی نظر
دام ہر سو ہیں بچھے اس عالم تصویر کے

۲

پڑی جھلکی جو سینے پر نگاہ لطف جاناں کی
ہوی بیدار ساری بستیاں دنیائے ارماں کی

تری زلفوں کا سایہ وہ شبستان مسرت ہے،
کہ جس میں کھیلتی ہیں مستیاں لاکھوں خمستاں کی

عجب کیا ہے کہ اس جوش جوانی سے پڑے ہل چل
نہیں یہ شوخیاں اٹکھیلیاں ہیں موج طوفاں کی

سحر کو لیں تبسم نے تری انگڑائیاں ایسی
کہ ہر ذرے سے پھوٹی اک کرن صبح درخشاں کی

باقیؔ

محمد عبد القیوم خاں ایم۔ اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر

میرے سرکار صلعم سے

جب صبح ہوئی نور کے دروازے پہ آکر
شفاف شعاعوں پہ قدم اپنے جماکر
مہتاب، شفق اور ستاروں میں نہاکر
کرتا ہوں میں انوارِ الٰہی کا نظارا　　　　صدقہ ہے تمھارا

جب دن نکل آیا تو جما روح کا دربار
ہر سمت برسنے لگے سچائی کے انوار
نیکی و اخوت کی بڑھی گرمئی بازار
ملنے لگا دنیا کو محبت کا سہارا　　　　صدقہ ہے تمھارا

دل، روح، نظر ڈوب گئے موجِ اثر میں
ایماں کا لہو گرم ہوا قلب و جگر میں
روشن ہوئے یہ ارض و سما دیدۂ تر میں
ماتھے پہ چمکنے لگا عرفاں کا ستارا　　　　صدقہ ہے تمھارا

رنگ اور چمک، لطف و نزاکت نظر آئی
ہر شئے میں بہشتوں کی لطافت نظر آئی
ہر چیز میں اللہ کی طاقت نظر آئی
ہستی کو ملا چشمِ الٰہی کا اشارا — صدقہ ہے تمھارا

مرتے ہیں تو آنکھوں میں ہیں پھر جینے کے ساماں
جیتے ہیں کہ مرنے کا ہے اک اور نگہباں
ہر وقت خوشی کے نظر آتے ہیں گلستاں
ہر آن غمِ زیست کی تلخی ہے گوارا — صدقہ ہے تمھارا

مُسافر

ترے بیتاب قدموں سے لرزتے ہیں بیاباں بھی — کہ ہے صحرا کے دامن میں ترا چاکِ گریباں بھی
تری آشفتگی کو بے نیازی آزماتی ہے — قریب آتا ہے جب رستہ، تو منزل دور جاتی ہے
اِدھر آ، اے خیالِ تشنگی میں ڈوبنے والے — اِدھر آ، اے سرابِ زندگی میں ڈوبنے والے
کہاں جاتا ہے لذت آشنائے پیچ و خم بن کر — ترے ارماں نہ مٹ جائیں کہیں نقشِ قدم بن کر
جنوں نا آشنا ہے شوق تیرا، زندگی تیری — ابھی سرکش نہیں ہے قوتوں سے بندگی تیری
غضب ہے بیڑیاں احسان کی پہنے ہوئے چلنا — غضب ہے اک فریبِ زیست کی آغوش میں پلنا
ذرا سینے کو اونچا کر، ذرا رفتار پیدا کر — اگر چلنے کی خواہش ہے، دلِ خود دار پیدا کر
ہے ننگِ دشت پیمائی بھروسہ رہنمائی کا — مسافر اس بیاباں میں نہ کھا دھوکا خدائی کا!

بانسری

بن میں اپنا راگ سناؤں　　من میں اپنی شمع جلاؤں
دل کی دنیا جگ کو دکھاؤں　　بیت نگر میں آگ لگاؤں

تانا نا ریرے تُردم ترانا تانا نا ریرے تُردم

میری دھن سے دنیا جاگے　　الجھیں من میں غم کے دھاگے
میرے کومل راگ کی لہریں　　جیسے بن میں ہرنا بھاگے

تانا نا ریرے تُردم ترانا تانا نا ریرے تُردم

جھلمل جھلمل جب ہوں تارے　　روتے بیٹھیں پریم کے مارے
اُس دم اپنا راگ سناؤں　　نکلیں منھ سے غم کے نعرے

تانا نا ریرے تُردم ترانا تانا نا ریرے تُردم

بھینا بھینا جب ہو اُجالا　　چرخ اُتارے تاروں کی مالا
جھرنے جھرنے بیٹھ کے پیتم　　سُنیو میرے دل کا نالا

تانا نا ریرے تُردم ترانا تانا نا ریرے تُردم

میکدۂ سحر

اے ساقیٔ سحر مری آشفتگی کو دیکھ　　اس میکدے کو دیکھ، مری تشنگی کو دیکھ
پھولوں کے جام بادۂ شبنم سے بھر گئے　　غنچوں کے رنگ پرتوِ خُور سے نکھر گئے
مدہوش اس شراب سے ہوتا نہیں ہے دل　　راحت کو اپنے ہاتھ سے کھوتا نہیں ہے دل

دستِ شفق میں ایک چھلکتا ہوا ہے جام
ہے جس میں نورِ بادۂ ہستی کا احتشام

لیکن مری نگاہ کے قابل نہیں ہے یہ
اک ذوقِ تشنگی کے مقابل نہیں ہے یہ

کچھ اور لا کہ روح کو تسکین ہو سکے
بزمِ خیال اور بھی رنگین ہو سکے

سورج، نسیم، پھول، کلی، باغ، عندلیب
سب خوش نگاہ، شاد نظر، اور خوش نصیب

ان میں مری حیات کا رنج و الم کہاں
ان کا دلِ غریب کہاں، میرا غم کہاں!

گُناہ

ذرے میں رقصِ برقِ شرارت کا آ گیا
آدم کسی کی بزمِ محبت پہ چھا گیا

شوخی، سمندِ شوق کی مہمیز ہو گئی
دوزخ کی آنچ اس کے لئے تیز ہو گئی

مخمورِ اضطراب، اثر دیکھتا نہیں
فردوس سامنے ہے مگر دیکھتا نہیں

گردن اٹھا کے خاک کا پتلا رواں ہوا
یہ ذرہ زمیں نہ ہوا آسماں ہوا

زہرہ میں اسکی دھوم ہے، اور کہکشاں میں دھوم
سنتے ہیں اسکے شوق کی کون و مکاں میں دھوم

یہ گرمیاں کہاں کی ہیں پہچانتے ہیں کیا؟
اسکے جنوں کو اہلِ فلک جانتے ہیں کیا؟

ہر سانس میں گناہ کی لذت ملی ہوئی
یوں ساکنِ زمیں کو عطا زندگی ہوئی!

فراق

عشق کو حسن کا دیدار دکھایا نہ گیا
تجھ سے بیتاب نگاہوں میں بھی آیا نہ گیا

اشکِ غم آنکھ سے جاری تھے ستاروں کی قسم
آگ سینے میں بھڑکتی تھی شراروں کی قسم

جب فلک سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا آیا
میں سمجھتا تھا کہ جینے کا سہارا آیا

شاید اس آہِ شکستہ میں اثر بھی آجائے
ڈھونڈتی ہیں جسے آنکھیں وہ نظر بھی آجائے

دُور جھرنے کی صدا سامنے پپیہو کی پکار
رات بھیگی ہوئی پڑتی ہوئی شبنم کی پھوار

اک سماں تھا تری آواز سُنانے کے لئے
قدرتیں جھوم رہی تھیں ترے آنے کے لئے!

اور جب چاند کے چہرے سے الٹتی تھی نقاب
یاد آتا تھا مجھے شوخ جوانی کا حجاب

ابر جب نُور کی محراب سے ہٹ جاتا تھا
اک تبسم ترے ہونٹوں پہ نظر آتا تھا

اے مری ہوش کی دنیا میں نہ آنے والے
کتنے جلوے ہیں تری یاد دلانے والے!

مقبرۂ رابعہ دَورانی

[اس نظم میں سوچا گیا ہے، کیا غم اور حُسن میں کوئی ربط ہے؟ کیونکہ مقبرہ غم کی یادگار ہے اور حسین ہے۔]

کس دَرد سے چھڑنے لگا پھر سازِ محبت
کس سمت سے آنے لگی آوازِ محبت

ماتم کدہ حُسن کی اِس نوحہ گری میں
حسرت کدہ عشق کی خونیں جگری ہیں

ہے درد کی دنیاؤں کا اک آئینہ خانہ
کس شان سے ہے جلوہ نما غم کا فسانہ!

دروازے پہ جو حوض ہے سرشارِ الم ہے
دنیائے محبت کا چھلکتا ہوا غم ہے

اور جوئے رواں اشکِ رواں کی ہے نشانی
ماں کے لئے خونبار ہے بیٹے کی جوانی

ہے سرو کی مانند نکلتی ہوئی آہیں
جو ڈھونڈتی ہیں عرش پہ پرواز کی راہیں

مینار نہیں دستِ دعا فاتحہ خواں ہیں
یہ امن و اماں کے لئے ہر سو نگراں ہیں

گنبد میں صدا گونجتی ہے نالہ و فریاد
بے ساختہ کرتا ہے کوئی نامِ خدا یاد!

بے رحم ہے اور خانہ برانداز زمانہ
دنیا سے مٹا دیتا ہے دنیا کا فسانہ

آنکھوں میں جفا کار کے جچتا نہیں کوئی
اس دشمنِ بیدرد سے بچتا نہیں کوئی
برباد نہ کر دے کہیں اس جنّتِ غم کو
بے کیف نہ کر دے کہیں اس دلِ محرم کو
اس واسطے معمار نے اس خُلدِ بریں میں
اس ماں کے دھڑکتے ہوئے سینے کی زمیں میں
صورت گریٔ حُسن اس انداز سے کی ہے
گویا کہ یہ غم دہر میں یادردِ ازلی ہے!

تابندگی و رفعتِ ارمان سے دیکھو
اس غم کے فسانے کو اسی شان سے دیکھو!

غزلیں

۱

دلِ غریب کی بپتا بیاں دکھا نہ سکے
ہم اسکے دردِ محبت کو آزما نہ سکے
نگاہِ شوق کو ہر ہر قدم پہ لغزش تھی
نظر ملا کے بھی اُن سے نظر ملا نہ سکے
خیالِ عشق کی رعنائیوں سے ڈرتا ہوں
بھلا ہوا کہ تصور میں وہ سما نہ سکے
یہ اور بات ہے تقدیر ہی بدل ڈالیں
لکھا ہوا مری تقدیر کا مٹا نہ سکے
غمِ جُدائیٔ پیہم کی خیر ہو یارب
وہ اپنی یاد کا دامن چھڑائے جا نہ سکے
نظر جُھکا کے دیا ساغرِ شراب مجھے
جو مانگتی تھیں نگاہیں وہی پلا نہ سکے
زہے نصیب کہ تیر و ہدف تھے مستِ وفا
نگاہ رک نہ سکی، دل کو ہم بچا نہ سکے

خدا گواہ کہ باقیؔ کے چاہنے والے
کبھی خلوص و محبّت اُسے دکھا نہ سکے

۲

رُوٹھ گئی ان کی نظر دیکھنا
جرمِ محبّت کا اثر دیکھنا

وصل کی اک آس مٹانا تو ہے — شام کو آئے گی سحر دیکھنا
دیکھ رہا ہوں پسِ پردہ اُسے — میرے حجاباتِ نظر دیکھنا
بن گئے افسانۂ طور و کلیم — دیکھنے والوں کا جگر دیکھنا
پوچھنے والے تو یونہی رہ گئے — مل گئی غیروں کو خبر دیکھنا
دیکھتا ہے آپ کو سارا جہاں — آپ کے قربان، اِدھر دیکھنا
ہوش، سکوں، زیست، تمنّا، خوشی — زیست کا سامانِ سفر دیکھنا

باعثِ جمعیتِ دل بن گیا
باقیؔ آشفتہ نظر دیکھنا

— ۳ —

مژدہ اے برقِ تجلی ہوش میں آتا ہوں میں — عشق بن کر وادیٔ ایمن پہ چھا جاتا ہوں میں
آنکھ والوں کو عبث دعویٰ ہے میری دید کا — جو نظر آتا نہیں اُس کو نظر آتا ہوں میں
میرے ذوقِ دید کا صدقہ جمالِ کائنات — حُسن کی آنکھوں پہ اپنا نور برساتا ہوں میں
مرحبا اے جذبۂ عشق آفریں، صد مرحبا — حُسن بن جاتی ہے دنیا جس طرف جاتا ہوں میں
میرا کھل جانا حقیقت، میرا سمجھانا حیات — راز بن کر راز کے آداب سمجھاتا ہوں میں
آئینہ خانے تماشہ ہیں مرے دیدار کے — حیرتوں کی زندگی آنکھوں سے دکھلاتا ہوں میں

اک کھلونا رکھ کے دو عالم کا اپنے سامنے
مجھکو بہلاتے ہیں وہ، اور ان کو بہلاتا ہوں میں

— ۴ —

خمارِ نیند کا آیا مرے فسانے سے — حسین سو ہی گئے سازِ دل بجانے سے

جہانِ عشق میں، کس سے بیاں کروں اے دل
جو نسبتیں ہیں مجھے اُن کے آستانے سے

جلایا عشق نے جب بجلیوں کا خرمن بھی
لپٹ کے رونے لگیں میرے آشیانے سے

چراغِ شام کی یہ ضوفشانیاں ہے نہ ہے
چمک رہی ہے فضا غم کے مسکرانے سے!

شکستہ ساز ہیں یہ سوزِ عشق، کیا کہیے
ستارے جھومتے ہیں میرے گنگنانے سے

بڑھی کہیں مہ و انجم سے آبرو دل کی
حسین خیال کے پہلو میں جگمگانے سے

مری حیات میں باقی اُمید و یاس کہاں
مجھے ہے کام فقط قسمت آزمانے سے

فاوسٹ

اِنتخاب

[فاوسٹ، المانی زبان کا منظوم ڈرامہ ہے جسے اُردو نظم میں لیا گیا ہے۔ اسی کا کچھ حصہ یہاں دیا جاتا ہے۔

اس ڈرامے کے اصل کردار دو ہیں، انسان اور شیطان۔ انسان ـــــ فاوسٹ ادھیڑ عمر کا عالم ہے جس نے اپنی ساری جوانی حصولِ علم میں بِتا دی۔ عمل کی لذت نہیں اٹھائی۔ اس فطری تقاضے کو پامال کرنے سے فاوسٹ انتشارِ مجسم بن کے رہ جاتا ہے اور اس کو انجان طور پر عمل کی تڑپ ستانے لگتی ہے۔ عمل کے نہ ہوتے علم ایک بڑا شیطان ہے، یہی شیطان فاوسٹ کو پھر سے جوان بناتا اور طرح طرح کے جُل دینے لگتا ہے جس کی واردات اس ڈرامے کی جان ہے۔

فاوسٹ کے قصے میں یوں تو زمین آسمان ایک کر دئے گئے ہیں مگر اس میں ٹیپ کا بند قلبِ انسانی کی وہ چٹکی ہے جہاں فاوسٹ اپنی مرمٹی جوانی واپس لیکر ڈرامے کی ہیروئن ـــــ مارگریٹ سے دوچار ہوتا ہے مارگریٹ۔ عورت! شیطان یہ تو جانتا ہے کہ ایک بدتوفیق کے لئے اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے! اگر یہ نہیں جانتا کہ اسکی محبت انجام کار کیا رنگ لاتی ہے!]

۱

تمہیدِ آسمانی

[شیطان بارگاہِ ایزدی میں جا رہا ہے، اسرافیل، میکائیل کے بعد جبرئیل کی تسبیح سُنتا ہے۔]

جبرئیل —

تری روشنی اسکو گرما رہی ہے — عروسِ زمیں رقص فرما رہی ہے
دو رنگی دوپٹہ ہے شام و سحر کا — ذرا دیکھنا روپ اس فتنہ گر کا
یہ دن، نورِ صبحِ بہشتِ بریں ہے — یہ شب ظلمتِ کاکلِ عنبریں ہے
سمندر کی موجوں پہ کف آ رہا ہے — یہ پانی پہاڑوں کو شرما رہا ہے
ہے چشمک سی ایوانِ حور و ملک پر — حبابِ زمیں تیرتا ہے فلک پر

پہاڑ اور دریا پہ گردش ہے چھائی
تری کبریائی تری کبریائی!

ابلیس بحضورِ باری

ابلیس —

"اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات" — حق یہ ہے کہ اک عشقِ مسلسل ہے تری ذات
بندوں کے قریب آنے کا دکھلا کے بہانہ — سُنتا ہے کبھی رحم سے تو دل کا فسانہ
میں تجھ سے اجازت کا طلبگار ہوا ہوں — اِک عرض لئے حاضرِ دربار ہوا ہوں
آئے گی ہنسی تجھکو مری آہ فغاں پر — نا چیز گراں ہو گا ترے کون و مکاں پر
سُورج کی زباں چاند کا دل مجھ میں نہیں ہے — اک زمزمۂ رُوح گسل مجھ میں نہیں ہے
ہر وقت ہوں تیرِ غمِ ہستی کا نشانہ — ہے میری زباں پر ترے آدم کا فسانہ
وہ خاک کہ ہے اِک کفِ بے برگ و نوائی — کرتی ہے زمینوں پہ تری نیم خُدائی

کچھ حد بھی ہے انسان کے اِس جرم و خطا کی　　کیوں تو نے اسے روشنی عقل عطا کی؟

غیب ــــ ابلیس شکوے کے سوا کچھ اور بھی تیری زبان پر آئیگا؟

شیطان۔ تیری دنیا میں نظر آتی ہیں اتنی شورشیں　　چاہتا ہوں میں وہاں کا آنا جانا چھوڑ دوں
ہر نفس گمراہیٔ آدم کی تیرے دیکھ کر　　جی میں آتا ہے کہ اب اس کا ستانا چھوڑ دوں!

[آسمان پر پردہ آجاتا ہے، ملائکہ غائب ہوجاتے ہیں۔]

[شیطان تنہائی میں]
کتنا پر لطف ہے نظارۂ انوارِ قدیم　　کتنی پرکیف ہے یہ صحبتِ آداب و نیاز
دیکھنا شانِ کریمی کہ خدائے قہار　　مجھ سے منکر کو عطا کرتا ہے اک ساعتِ راز!

۲

فاؤسٹ اور شیطان

[شیطان حضورِ باری سے واپس ہو کر فاؤسٹ پر ظاہر ہونا چاہتا ہے ابتدا روحِ ارضی اس سے یوں گویا ہوتی ہے]

طوفانِ ہستی　　سیلابِ عالم　　کرتی ہے دنیا　　میرا ہی ماتم
تخلیقِ دنیا　　انجامِ ہستی　　صبحِ جہاں ہوں　　یا شامِ ہستی
روحِ سمندر　　پرواز میری　　کون و مکاں میں　　آواز میری
ہاتوں میں میرے　　یزداں کا دامن　　چرخِ بریں پر　　میرا نشیمن
عمرِ زمانہ　　وقتِ زمانہ　　میرا فسانہ　　میرا فسانہ!

[آخر میں شیطان ظاہر ہو کر یوں مخاطب ہوتا ہے]

شیطان ــــ علامۂ عصر کی جناب میں کورنش

فاؤسٹ ــــ کون؟ .... تمھارا نام؟

شیطان۔ جس کو ہر چیز سے انکار ہے وہ روح ہوں میں　　ملحد و منکر و بے دین کا ممدوح ہوں میں

نفی کرتا ہوں ہر اک چیز کی اس دنیا میں — آج کو دیکھتا ہوں آئینۂ فردا میں
رنگِ موجود میں سامانِ عدم ہے دنیا — ہائے کیا عجیبی شانِ کرم ہے دنیا!
روحِ عصیان و تکبر میں جگہ پائی ہے — خاکسارِ ازلی جرم کا شیدائی ہے!

[فاوسٹ مایوس ہے۔ اسکا دل پھیرنے کیلئے شیطان روحوں سے نغمہ سنواتا ہے]

نغمۂ ارواح —

غائب ہو تاریک — اے آسماں تو — ہو جا نمایاں — اے جاوداں تو
اے کاش بادل — چھٹ جائیں سارے — چمکیں فلک پر — خوش رنگ تارے
رنگین موسم — پُر کیف عالم — گہوارہ جس کا — پہلوئے شبنم
خاموش سورج — خاموش مہتاب — رفعت کے مینار — جلووں کے گرداب
حسنِ فلک کے — یہ پردہ در ہیں — حیرت اثر ہیں — نورِ نظر ہیں
گردش میں ان کی — جذبات دل کے — تڑپانے والے — یہ آب و گل کے
تھراتے جائیں — لہراتے جائیں — فرشِ زمیں کو — چمکاتے جائیں
ہر سمت پیدا — فصلِ بہاری — طوفانِ عشرت — پر سبزہ کاری
شاخوں کے اندر — زلفوں کا خم ہے — خوشوں کے اندر — صہبا کا نم ہے
وہ دیکھ انگور — کی سبز بیلیں — جس طرح کمسن — معشوق کھیلیں
چھوٹے سے میداں — جوششِ ہوا کے — چھوٹے سے ساحل — موجِ حنا کے
راہِ نمو کی — چھوٹی سی منزل — رنگِ طرب کی — خاموش محفل
اڑتے ہیں ان پر — پرواز والے — رنگِ طرب کے — ننھے رسالے
سورج کی جانب — پرواز ان کی — ٹاپو کے اوپر — آواز ان کی

اڑتے ہیں اکثر	بالائے کہسار	قدرت کے گویا	رنگیں ہوا دار
نورِ ازل پر	قرباں نہیں یہ	گویا حریف	انساں نہیں یہ!

[فاوسٹ شیطان سے بیعت کر لیتا ہے]

۳

شیطان اور طالب علم

[فاوسٹ اور شیطان ملکر عالمِ اصغر کی سیر کو جانا ہی چاہتے ہیں کہ ایک طالب علم آتا ہے۔ شیطان جلدی سے فاوسٹ کا جبہ اور عمامہ پہنکر طالب علم کے سامنے یوں گل افشانی کرتا ہے۔]

شیطان — ہاں تو یہ بتاؤ تم کونسا شعبۂ علم اختیار کرو گے؟

طالب علم — میں چاہتا ہوں ساری کائنات کھنگول ڈالوں

شیطان — کیا خوب، یہی سیدھا راستہ ہے — ...... [منطق پڑھنے کی رائے دینے کے بعد شیطان علم کیمیا پر یہ رائے دیتا ہے]

[کیمیا]

زندہ اشیاء کی جو تحقیق کیا کرتا ہے — جانِ تخلیق پہ اک تازہ جفا کرتا ہے
روح کو چھوڑ کے قالب پہ نظر ہے اسکی — واہ اسرار پہ کیا فتح و ظفر ہے اسکی!
شے کی تحقیق پہ جب طبعِ بشر آتی ہے — جسم رہ جاتا ہے اور جان نکل جاتی ہے
کیمیا نام ہے اس علم کی غداری کا — بول بولا رہے افکار کی بیداری کا!

طالب علم — خوش نصیب ہے وہ جو آپ سے تحصیل علم کرے ...... میں جناب سے دینیات کیوں نہ پڑھوں۔

شیطان — میں تجھے گمراہ نہ کروں گا بلکہ سچ سچ بتادوں گا۔

[دینیات]

اس علم میں بھی گمرہی قلب و جان ہے — یہ اک فسانہ جھوٹ کی اک داستان ہے
تم اس میں ایک خضر سے رہبر کو ڈھونڈلو — ظلماتِ علمِ دیں کے سکندر کو ڈھونڈلو
اس کی زبان و لفظ پہ لو بیعتِ خیال — ہر نقش پائے یار پہ ہو سجدہ پائمال
الفاظ ہیں یقین کی اک سجدہ گاہِ راز — آؤ درِ یقین پہ جھکائیں سرِ نیاز!

الفاظ سے ہے معرکۂ بحث اور دلیل
الفاظ انتظامِ زمانہ کے ہیں کفیل

الفاظ سے ہے جوشِ یقیں، جوشِ اعتقاد
ایماں کے معرکے میں ہے الفاظ کا جہاد

معنی کی سلطنت میں ہے جوری خیال کی
الفاظ جاں ہیں زندگی لازوال کی!

۴

فاوسٹ اور جادوگرنی

[شیطان فاوسٹ کو جوان بنانے کے لئے ایک جادوگرنی کے پاس لیجاتا ہے جس کی دکان میں ایک لنگور بڑے بلورین گولے سے کھیلتا ہوا گیت گا رہا ہے۔]

دنیا گول اور عقبیٰ گول ۱ قدرت کا ہے دھندا گول
جگمگ جگمگ دنیا ہے ۴ روشن گوشہ گوشہ ہے

دنیا کی ریتی کو جانچ ۲ اسکو پہنچا دل کی آنچ
میں گو اس دم زندہ ہوں ۵ کل جو دیکھو مردہ ہوں

کھن کھن کھن کھن کرتی ہے ۳ مٹنے کا دم بھرتی ہے
میری قسمت مٹی کی ۶ میری دولت مٹی کی

دنیا کا سُن اے دل حال، ٹوٹے جیسے جام سفال!

۵

مارگریٹ اور فاوسٹ

[شیطان فاوسٹ کو زندگی کی گوناگوں لذتوں سے آشنا کرتا ہے کہ ایک دفعہ راستے میں ایک لڑکی پر فاوسٹ کی نظر پڑتی ہے جس کا نام مارگریٹ ہے۔]

فاوسٹ ۔ (مارگریٹ کو دیکھ کر)

آہ کیا حسن ہے کیا اسکی طرحداری ہے
پیکرِ نور میں قدرت کی قلم کاری ہے

پاک، معصوم، طرحدار، گل اندام، حسین
دلبر ایسا نگہ شوق نے دیکھا ہے کہیں؟

عصمتِ حسن میں اک شوخی انداز بھی ہے
نیچی نظروں میں چھپی اک نگہ ناز بھی ہے

صبح کی طرح چمکتے ہوئے رخساروں میں
دھوپ کھلتی نظر آتی ہے چمن زاروں میں

شمعِ الفت کبھی خاموش نہ ہوگی مجھ سے
چشمِ مخمور فراموش نہ ہوگی مجھ سے

کر گئی نقش عجب چشم غزالاں اسکی
یاد رکھ طرز ادا اے دلِ نالاں اسکی

نورافزائے زمیں نرگسِ بیمار تھی کیا
لبِ گلرنگ کی شیرینیٔ گفتار تھی کیا

میرا ہر تارِ نظر صدقۂ رعنائی تھا
اس کا دیدار تھا یا عہدِ جبیں سائی تھا!

[شیطان آتا ہے]

فاوسٹ ۔ سُن میں اس نازنین کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

شیطان ۔ کون ہے وہ ؟

فاوسٹ ۔ وہ، جو ابھی اس راہ سے گذری

وہ معصوم ہستی، وہ معصوم دنیا؟
گناہوں سے ہے پاک جس کی تمنا؟

جو معبد کو جا کر چلی آرہی ہے؟
جو حورانِ جنّت کو شرما رہی ہے؟

میں اس کی ہی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا
میں اس کی دعائے حسیں سُن رہا تھا

وہ عصمت کی دیوی، وہ قدسِ مجسم
وہ پاکیزگی کی سحر خیز شبنم

کہیں اس کے دل میں کثافت نہیں تھی
اسے ان دعاؤں کی حاجت نہیں تھی

حیا کی قسم، قالبِ نور ہے وہ
مری دسترس سے بہت دور ہے وہ!

۶

فاوسٹ مارگریٹ کے مکان میں

[شام کا وقت ۔ چھوٹا سا پاک صاف کمرہ جہاں شیطان اور فاوسٹ چپکے چپکے داخل ہوتے ہیں ۔
فاوسٹ کمرے کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے۔]

فاوسٹ ۔

اے رنگِ شفق گنبدِ اخضر پہ رواں ہو
اے نورِ ازل وقت ہے اب شعلہ فشاں ہو

یہ صومعۂ حُسن ہے یا صبحِ لطافت
غنچوں کی نمی اس میں ہے پھولوں کی صباحت

اے صلِّ علیٰ جلوۂ سُرخِ شفقِ شام
اک طورِ تجلی ہیں محبت کے در و بام

عصمت کی شعاعیں ہیں لطافت کی ہوائیں
دوشیزہ ادائیں ہیں محبت کی فضا میں

اس حجلۂ قدسی کے در و بام تو دیکھو
تنظیم کی ضو، جلوۂ آرام تو دیکھو

عسرت کی ہواؤں میں ہے رنگِ مہ و اختر ہے حُسن کی دولت سے فضا کتنی تونگر!

[آرام کرسی سے] [ایک چرمی آرام کرسی پر جو مسہری کے قریب ہے دراز ہوتے ہوئے فاوسٹ کرسی سے یوں مخاطب ہوتا ہے]

آغوش میں اپنی مجھے اے دوست چھپا لے اک بیخود و مجبورِ محبّت کی دُعا لے
معلوم نہیں کتنے ہی معصوموں کو تو نے معلوم نہیں کتنے ہی مظلوموں کو تو نے
آغوش میں الطاف و عنایت سے ہے پالا تو دستِ کرم ہے کہ محبّت کا اُجالا
شاید مرا محبوب بھی عصمت میں نہا کر مسرور ہوا ہو گا تری گود میں آکر

[فاوسٹ مسہری کا پردہ اٹھاتا ہے اور مارگریٹ کے بستر پر اس کی نظر پڑتی ہے۔]

بستر نہیں آغوشِ کرم جائے اماں ہے اِک ہستیِ معصوم کا گہوارۂ جاں ہے
اس پر مرے محبوب کو فطرت نے بصد ناز بچپن سے دیا ہے نگہِ حسن کا اعجاز
بخشی ہے جوانی اسے یاں عمرِ رواں نے پالا ہے اسے گود میں حورانِ جناں نے

[چند دنوں کے بعد فاوسٹ اور مارگریٹ کی ملاقات ہو جاتی ہے محبت کی پینگ بڑھتی ہے۔ مارگریٹ فاوسٹ کے بازو کا سہارا لیئے ہوئے ایک باغ میں ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔]

مارگریٹ۔ میں جانتی ہوں آپ کو میرا خیال ہے ورنہ جہاں میں کیا مرا حُسن و جمال ہے!
جس طرح اک مسافرِ خوش ذوق و امتیاز رہتا ہے نائے و نوش کی لذت سے بے نیاز
مسرور ہیں جناب بھی اُس خاکسار سے فصلِ خزاں عزیز ہے فصلِ بہار سے
فاوسٹ اک دردِ سر جناب کو ناحق ستائے گا باتوں میں میری آپ کو کیا لطف آئیگا؟
کیا تجھکو بتاؤں کہ تری لذّتِ گفتار ہے میرے لئے راحتِ دل، عشرتِ بیدار
شیرینیٔ نغمہ ہے تری نرم صدا میں اِک نورِ بصیرت ہے تری آب و ہوا میں

[مارگریٹ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے]

مارگریٹ ۔ اپنے ہونٹوں کو نہ دیجے کبھی اتنی تکلیف — کیجئے میری نگاہوں کی نہ اتنی تعریف
آپکی قدر کے قابل نہیں دستِ حزیں — آپ کے عشق کے لائق نہیں یہ خاک نشیں

[آگے بڑھتے ہیں]

[ایک دن مارگریٹ فاوسٹ سے یہ سوال کرتی ہے کہ وہ کلیسا میں جاکر نماز کیوں نہیں پڑھتا اور خدا کا نام کیوں نہیں لیتا؟ فاوسٹ جواب دیتا ہے]

فاوسٹ ۔ کیا مری آنکھ میں جلوے ترے آباد نہیں — کیا مجھے حُسن کے خالق کی ادا یاد نہیں؟
کیا نہیں صاعقۂ عشق سراپا میں ترے — کیا نہیں موجِ ازل حُسن کے دریا میں ترے؟
برقِ عرفان، تری زلفِ گرہ گیر نہیں؟ — تجھ میں کیا خالقِ کونین کی تصویر نہیں؟
پہلے اس قوتِ جاوید کو اپنا کرلے — دل میں اس صاعقۂ حُسن کو پیدا کرلے
اور جب جوشِ محبت تجھے گرما جائے — رکھ لے جو نام خدا کا تجھے یاد آجائے
نام اس کا ہی سمجھ قلب سے جو آئے صدا — عشق، دل، ہوش، خرد، رحمتِ جاوید، خدا!

[عالم اصغر کی سیر کرتے ہوئے شیطان فاوسٹ کو رات کے وقت ہارٹز کے عظیم سلسلۂ کوہسار میں لیجاتا ہے فاوسٹ پہاڑوں میں چشموں اور جادو کی روشنیوں پر یوں اظہار خیال کرتا ہے ۔]

فاوسٹ ۔ پہاڑوں میں چشموں کی دیکھو روانی — اُبلتا ہے دریا سے جوشِ جوانی
تماشہ مچلنے کا دکھلا رہے ہیں — بہے جا رہے ہیں بہے جا رہے ہیں
[چشمہ پر] یہ شورش نہیں نغمۂ جانفزا ہے — ضمیرِ محبت کہیں بولتا ہے
بہشتِ بریں کی صدا آ رہی ہے — اُمیدوں کا گلزار دکھلا رہی ہے
محبت کے پردوں کی آواز سُننا — یہ نغموں میں ڈوبے ہوئے ساز سُننا
گذشتہ زمانے کی جھنکار آئی — جہاں کی صدائے فسوں کار آئی
اُبھی چاہتا ہوں بہت روز جینا — بہار آفرینا بہار آفرینا“

[پہاڑوں، درختوں اور غاروں میں جادو کی روشنیاں مچل رہی ہیں ۔]

فاوسٹ ۔ گو صبح کی شفق کی طرح دل لبھاتی ہے
کیسی اداس روشنی غاروں سے آتی ہے

[روشنی پر] یاں بھاپ واں غبار، یہاں جوش واں خروش
یاں خاک خوں فشاں ہے، تو واں آبِ شعلہ پوش

پھلجھڑیاں جل رہی ہیں کہیں رنگ و نور کی
اور بجلیاں کہیں ہیں فضائے بلور کی

جب موج شعلہ ریز خراماں گذرتی ہے
سونے کی ریت گویا زمیں پر بکھرتی ہے!

جادوگرنی ۔ [فاوسٹ کو عجائبات کی ایک دوکان نظر آتی ہے جسے ایک جادوگرنی لگائے بیٹھی ہے جادوگرنی کہتی ہے]

صاحبو میری دکاں سے یونہی آگے نہ بڑھو
اور نہ دیکھے ہوئے ساماں کوئی سیڑھی چڑھو

ہر طرف دیکھنا موجود ہے سامان نیا
ہر قدم پر نظر آتا ہے اِک ارمان نیا

زحمتِ دہر کی ہر چیز ہے ناچیز کے پاس
ایک طوفان نظر ہے مری دہلیز کے پاس

کوئی خنجر نہیں ایسا جو نہیں ہے خونخوار
جام کوئی نہیں جو غم سے نہیں ہے سرشار

جام میں زہر ہے، شمشیر میں غداری ہے
کتنا چمکا ہوا آئینِ وفاداری ہے!

کوئی تلوار نہیں جو یہ کمیں گاہ خفی
دوشِ دشمن پہ پسِ پشت سے ماری نہ گئی

کوئی زیور کوئی گوہر نہیں دوکاں میں ہی
عصمت و حسن کی جس سے کبھی عزت نہ گئی

حسنِ معصوم کی ترغیب کے آلے ہیں یہ
دستِ انساں کے بچھائے ہوئے جالے ہیں یہ!

قید خانہ

[آخری منظر۔ شیطان فاوسٹ کو ایک سال تک ترغیباتِ دنیوی کا شکار کرتا ہے۔ مارگریٹ جو اس وقت ایک بچے کی ماں ہے اسکے دل سے فراموش ہوجاتی ہے۔ ملک کا قانون مارگریٹ کو ناجائز شادی کے الزام میں گرفتار کرکے قتل کی سزا سناتا ہے۔ فاوسٹ کو خبر ملتے ہی وہ شیطان کی مدد سے قید خانہ جاتا ہے تاکہ مارگریٹ کو چھڑا کر لے بھاگے۔ غمزدہ اور دیوانی مارگریٹ رات کے وقت فاوسٹ کو قید خانے میں آتا ہوا دیکھ کر اُسے کوئی قاتل سمجھتی ہے]

مارگریٹ ۔ کس نے بھیجا ہے یہاں اے ستم ایجاد تجھے؟
کیا سنائی نہیں دیتی مری فریاد تجھے؟

ایک قاتل کی طرح رات گئے کیوں آیا؟ — کس طرح تو نے مری قید کا رستہ پایا؟
نصف شب اور مجھے عمر کا غم کھانے دے — صبح کا نور تو آنکھوں کو نظر آنے دے
نوجوانی مرے قدموں سے لگی ہے ابتک — کمسنی میرے لئے جاگ رہی ہے ابتک
اس گھڑی موت کا پیغام چلا آتا ہے — کنگرہ عرش کا وہ دیکھ ہلا جاتا ہے!

[پھر عالم نیم دیوانگی میں بھی فاوسٹ کو پہچان کر اُسے اپنے بچے کے خبر لینے کی ہدایت کرتی ہے جو جنگل میں پھینک دیا گیا ہے اور قیدخانے سے بھاگ نکلنے سے انکار کرتے ہوئے کہتی ہے]

مارگریٹ۔

یہ آخری سحر ہے مری عمرِ تلخ کی — اب مٹا رہی ہے مری شمع زندگی
یہ دن مری حیات میں شادی کا روز تھا — یہ نُورِ جاں نواز تھا عشرت فروز تھا
دیدار یار دیکھ کسی سے بیاں نہ کر — یہ نقدِ زندگی ہے اسے رائگاں نہ کر
اب بوستانِ حُسن کے شرما گئے ہیں پھول — وہ دیکھ میرے ہار کے مرجھا گئے ہیں پھول
اب وقتِ مغتنم کی نوازش نہیں رہی — اب عشرتِ حیات کی خواہش نہیں رہی
وہ دیکھ اضطرابِ تماشا، وہ خلفشار — اہلِ جہاں کو موت کا میری ہے انتظار
اِک چادرِ سیاہ مرے سر پہ ڈال کے — قاتل کھڑا ہوا ہے وہ آنکھیں نکال کے
مشکیں کسی ہوئی ہیں تو بازو اسیر ہیں — اعضا شکارِ معرکۂ دار و گیر ہیں
شمشیرِ تیز سر پہ مرے بے نیام ہے — اِک جُرمِ خاص کا یہ تماشائے عام ہے

آنسو نہیں، تپش نہیں، آہ و فغاں نہیں
خاموشیٔ عدم ہے فضائے جہاں نہیں!

[اسی بحث میں سویرا ہونے کو ہے شیطان فاوسٹ کو کلیسا سے کھینچ کر اڑ جاتا ہے۔ مارگریٹ فاوسٹ کا نام لیکر پکارتی ہے عجیب سے آواز آتی ہے۔ مارگریٹ کی نجات ہو گئی!]

بدر ۔ ابو الکلام ڈاکٹر محمد بدر الدین ایم بی۔بی۔ایس (عثمانیہ)

حسن، عشق اور رومان کے رنگین مزاج، رنگین خیال شاعر ہیں۔ جذبات کی رو میں اس طرح بہتے ہیں جیسے کوئی خوش گلو کشتی بان کشتی کھیتے ہوئے موجِ رواں کو نغمے پلاتا ہو۔ سلاست اور روانی ان کے نغموں کی جان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر ہر حال میں شاعر رہتا ہے۔ علم طب کے پوست استخواں میں رہ کر بھی انہوں نے شعر کی روحانی نگاہ پر مادیت کے پردے پڑنے نہیں دئے۔ ان کی انوکھی نظم "جراثیم" میں انکا "تحقیق کا گل کھلانا" قابلِ داد ہے۔ اپنی شیریں بے تکلفیوں کے ساتھ جہاں وہ زندگی کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں لطف آجاتا ہے۔ پھول کی سرگزشت، دلہن اور سورما میں بدر کی چاندنی خوب کھلی ہوئی ہے۔

پھول کی سرگزشت

ظلمتِ شب سے ہے لرزاں دلِ نازک میرا
مجھے تاروں کی یہ چشمک نہیں بھاتی اصلا
کانپتا ہوں جو فلک پر کوئی تارا ٹوٹا
حسرت آلودہ ہے کچھ آج فلک کا چہرا

اوس پڑتی ہے مسلسل کہ فلک روتا ہے
صبح تک خیر نہیں دیکھئے کیا ہوتا ہے

آہ فطرت نے مجھے آنکھ کا تارا سمجھا
تختۂ گل تھا مرے واسطے اک گہوارہ
جھونکے دیتی تھی وہ جنگل کی پری ٹھنڈی ہوا
ایسے نازوں سے میں وادی میں پلا اور رہا

رس جو ٹپکا تو مرے داغِ جگر دھلنے لگے
حوصلہ بڑھنے لگا بندِ قبا کھلنے لگے

سانس چلنے لگی رحمت کی ہوا آنے لگی
رنگ چڑھتا گیا صورت مری شرمانے لگی

دیدہ بازی مجھے خورشید کی کچھ بھا نے لگی
خود نمائی مرے نیرنگ کو جھلکانے لگی

ہائے ایسے میں کوئی کیوں مجھے برباد کرے؟
تن بہ تقدیر ہوں گلچیں کو خدا شاد کرے

صورتیں وہ کہ کریں حورِ جناں بھی تعریف
موت کے ہاتھ نے چھینا تھا جنھیں بن کے حریف

رگ و ریشہ میں ہے مٹی کے وہی خونِ شریف
مجھے دیکھو کہ اُسی خاک کی ہوں روحِ لطیف

لاکھ جانیں ہیں نہاں ہم سے بھی بے جانوں میں
دوڑتی پھرتی ہیں روحیں مری شریانوں میں

چیر کر دل مرا کوئی تو تماشا دیکھے
کتنے جلوے ہیں مرے طور پہ سینا دیکھے

مری اس ننھی سی ہستی میں ہے کیا کیا دیکھے
دیکھنے والا اگر دیکھے تو دنیا دیکھے

ہوں تو ہنس مکھ ہی مگر چاک ہے سینہ میرا
یہ بھی اک راز ہے کانٹوں پہ ہے جینا میرا

کیا وہ جینا جو نہ ہنگامہ ہو برپا یارب
ایسے جینے سے تو بہتر ہے نہ جینا یارب

حُسن کو بزم بنا عشق کو گرما یارب
خیر یوں ہی سہی گر ہے تر امنشا یارب

عشق کو آگ میں جلنے کے لئے پیدا کر
حُسن کو خاک میں ملنے کے لئے پیدا کر!

سحر کی نیند

قمر غریب مسافر ہوا ہے سست قدم
کٹی ہے آنکھوں میں شب اور ہے خواب کا عالم

وہ روشنی بھی ستاروں کی پڑ گئی مدھم
وہ گر کے فرش پہ سبزے کے ہو رہی شبنم
سحر کے وقت مزا نیند کا جو آنے لگا
چراغِ طور بھی جھونکوں سے جھلملانے لگا

الٰہی کیا ہے کہ ہے محفلِ جہاں خاموش
تڑپ تڑپ کے ہوا ہے مریضِ جاں خاموش
حریمِ ناز میں ہے سازِ مہوشاں خاموش
بھڑک بھڑک کے ہوئی شمعِ خوں فشاں خاموش
الٰہی ہوش رُبا ہیں یہ برکتیں تیری
شراب بن کے اُترتی ہیں رحمتیں تیری

شاعر

کوہ کے چہرے پہ ہے وحشت سی کیوں چھائی ہوئی
پھول کی نازک سی صورت کیوں ہے مرجھائی ہوئی
کون ہے جو فکرِ نامعلوم سے گھلتا نہیں؟
ننھے غنچے کے ہیں کیوں سب بند کچھ کھلتا نہیں؟
حُسن کا جی ڈوبتا ہے اور سرگرداں ہے عشق
روز و شب کا دیکھ کر انجام کچھ حیراں ہے عشق
ذرّے ذرّے کو نمودِ حُسن کی تھی کیا اُمنگ
موت کا نقشہ جو دیکھا اُڑ گیا چہرے کا رنگ؟
بیٹھ دو جا کر ڈھنڈورا مصر کے بازار میں
زندگی ہر روز بٹتی ہے مری سرکار میں
حُسن کو زندہ کروں رنگینیٔ تصویر سے
رنگ و بُو کو باندھ دوں الفاظ کی زنجیر سے
ذرّہ کو خورشید کی تابندگی دیتا ہوں میں
پتّی پتّی کو چمن کی زندگی دیتا ہوں میں
دیکھ لیتا ہوں مغنّی کو صدائے چنگ میں
آنکھ میری ڈھونڈ لیتی ہے صنم کو سنگ میں
ہے دمِ عیسیٰ جھلکتا تیرے ہر کردار سے
موت کو ٹھکرا رہا ہوں شوخیٔ رفتار سے
خود شناسی کا خدارا گر تو سکھلا دو مجھے
میرے دل کی تہ میں کیا ہے کوئی بتلا دو مجھے

ہاں مگر صدیوں کے سوز و ساز کا حاصل ہے یہ
ارتقائے رنگ و بُو کی آخری منزل ہے یہ

شور شوں سے بزم کی بیزار جب ہوتا ہوں میں
دل کی گہرائی میں ڈوبا چین سے سوتا ہوں میں

شادی و غم اپنی ہستی کو مگر کھونے لگے
بے نیازی کے تبسم میں یہ گم ہونے لگے

مرنے جینے سے بھی اونچی ہے کہیں میری نظر
اور ہی مئے یا الٰہی میرے پیمانہ میں بھر

جراثیم

جراثیم میں بھی طرحداریاں ہیں
فضا میں قضا کی یہ چنگاریاں ہیں

یہ افشاں سے ہیں کاکلِ عنبریں کے
شنریجہ پہ تارے ہیں چرخ بریں کے

اُنھیں پالنا نازبرداریوں سے
بڑی کاوشوں اور بیداریوں سے

بہت تجربوں سے یہ پائے ہوئے ہیں
یہ تحقیق کے گل کھلائے ہوئے ہیں!

یہ لڑیاں ہیں اُن کی کہ موتی کے دانے
اُنھیں شکل پیاری عطا کی خدا نے

یہ افعی ہیں یا موت کے نامہ بر ہیں
ستم کوش فطرت کے نیر نظر ہیں

رگ و ریشہ گویا ولایت ہے ان کی
قضا کا ہراول سرایت ہے اُن کی

کُھلے بند دل کوئی کوئی گھات میں ہے
سکندر کوئی بحرِ ظلمات میں ہے

وہ جیتا بچے کب جو بسمل ہے اُنکا
لُعابِ دہن زہرِ قاتل ہے ان کا

ہر اک فرد ان میں کا رنگیں ادا ہے
اگرچہ ہے ظالم بڑا دلربا ہے

رگِ جاں کا دشمن یہی نازنیں ہے
جلالِ مشیت بھی کتنا حسیں ہے!

راج کماری

تمکنت ناز و ادا اور وہ بانی تیری — حسن پر ایک قیامت ہے جوانی تیری
کتنی رنگین ہے طفلی سے کہانی تیری — دعوتِ دار و رسن زمزم بیانی تیری

تیرے مشتاقوں میں ہے نغمۂ آہن برپا
تیرے ابرو کے اشاروں نے کیے رن برپا

نازکی وہ ہے کہ موجِ نفسِ گل سے سوا — غیرتِ حسن کہ خورشید نہ دیکھے چہرا
اتنی مغرور کہ خاطر میں نہ آئیں راجا — تیرا کاشانہ ہے کچھ بامِ فلک سے اونچا

دل ہمالہ سے قوی تر یہ ہے نازک اتنا
دونوں آنکھوں سے رواں بات میں گنگا جمنا

سورما کھینچ کے چلے ہیں ترا ڈولہ لینے — ہار اک بار گلے ڈال کے تو ہار بنے
اپنے شوہر کی رضاجوئی ہو منظور تجھے — آبنے بات تو ناموس پہ تو نذر چڑھے

آبرو تیری ہو جانبازوں کی تلواروں پر
تو کرے رقص دہکتے ہوئے انگاروں پر

تو ہے وہ پھول تمناؤں سے جو آئے نظر — جو بڑھے راجا و پرجا کی دعائیں لے کر
روز و شب در پہ نگہبان ترے شمس و قمر — ابرِ رحمت ہے کہ آکاش کا منڈل سر پر

مایۂ ناز ہے تو قوم کی پیاری تو ہے
دیس کی نورِ نظر راج دلاری تو ہے

دکن

ہند کی تو اے دکن ابھری ہوئی روشن جبیں
دل فریب ایسی بنائی حق نے تیری سرزمیں

تیری مٹی سونگھتا تھا عارفِ گیسو دراز
تیرے سایہ میں بڑھا ٹیپو شہِ قاتل نواز

بھا گئی تیری ہوا جب آسمانِ پیر کو
گود میں تیری سلایا شاہِ عالمگیر کو

چرخ نے بھولے نہیں ماضی کے افسانے ہنوز
شاہ نامہ پڑھ رہے ہیں تیرے ویرانے ہنوز

سربسر خاموش نغمہ تیرے میدانوں میں ہے
شاعری کی جان گویا تیرے بیابانوں میں ہے

اشک بھر لاتا ہوں جا کر آبشاروں میں ترے
ہوں قفس میں خوش کہ ہے یہ سبزہ زاروں میں ترے

کھب گئی اغیار کی آنکھوں میں زرخیزی تری
روکشِ خلدِ بریں شانِ دلآویزی تری

تیرے جنگل ہیں معطر وادیاں سرشار ہیں
ندیاں سیماب گوں تیرے گلے کا ہار ہیں

سادگی دوشیزہ صورت تیرے کاشانوں میں ہے
حسنِ قدرت کی ضیا تیرے شبستانوں میں ہے

چاندنی راتیں تری پرکیف اور ٹھنڈی ہوا
سیرگاہِ حضرتِ باری تری رنگیں فضا

چوں کہ بودی از ازل تو ہمچنیں تابندہ باش
اے دکن آزاد باش و شاد باش و زندہ باش

شباب کی زبانی

میں قہر ہوں میں برق ہوں طوفانِ بلا ہوں
اس پر نفسِ گل سے نزاکت میں سوا ہوں

بیتابی و مستی مری رگ رگ میں بھری ہے
کھیتی یہ زمانہ کی مرے دم سے ہری ہے

سایے میں ستاروں کی لطافت میں فضا کی — ہر جا مرے جلوے ہیں یہ قدرت ہے خدا کی
وادی میں ہو سبزہ، طرب انگیز فضا ہو — لہرائیں علَم پھولوں کے، نوخیز ہوا ہو
اور کوہ ہوں ایسے کہ جو جنگل سے ہرے ہوں — جنگل کے شجر سارے شگوفوں سے بھرے ہوں
کھا کھا کے ہوا دشت بھی سرشار بنا ہو — خورشید جہاں تاب نمودار ہوا ہو
اس پر طرفِ کوہ ہو دریا کی رَوانی — کہتے ہیں اسے شاہدِ فطرت کی جوانی!
گہ ابرِ بہاراں پہ چلے میری سَواری — گہ تخت مرا لیکے اُڑے بادِ بہاری
حیراں مری سیماب وشی پر فلکِ پیر — نیرنگیٔ تقدیر مری چال کی تصویر
تھا میری طبیعت کو تجسّس کا جو لپکا — جنّت میں بھی سامان نہ تھا میری تڑپ کا
مستانہ روِش میری لُبھاتی نہیں کس کو — یہ شانِ تکبّر مری بھاتی نہیں کس کو؟
اونچا ہے مرا سب سے نشاں روزِ ازل سے — ہے حضرتِ یزداں بھی جواں روزِ ازل سے
بھاتی ہے مرے دل کو ادا شام و سحر کی — رنگین ہے دنیا مری رنگین نظر کی
چاہوں تو نگینے میں سُلیماں کو دکھاؤں — چاہوں تو ستارے میں ابھی توڑ کے لاؤں
میدانِ وغا کو ہے مرے دم کا سہارا — میں تاجِ سرِ حُسنِ بتانِ سمن آرا
مرنا مرا مرنا کہ پھر اک حشر بپا ہو — جینا مرا جینا کہ قیامت بھی فدا ہو
جینے کو تو جی جاتا ہے انسان بہر طور — سچ ہے کہ جوانی میں ہے جینے کا مزا اور
پیری کی میں دانائی و بینائی سے گذرا — دنیا کی حقیقت کی میں آگاہی سے گذرا
ڈھلنے کا سماں مجھ کو دکھانا نہ الٰہی — اس تخت سے نیچے مجھے لانا نہ الٰہی

دائم رہیں قائم مرے ہر حال خط و خال
یارب ہوں جواں مرگ، جواں بخت جواں سال

شکست

قدم قدم پہ کلفتیں جہانِ بے ثبات کی
الٰہی! صبر آزما ہے کشمکش حیات کی

ہے ایک دل ہزار غم اگرچہ اس میں کیف ہو
مگر مرے غرور کو شکست ہو تو حیف ہے

یہ زندگی تو اصل میں اُمنگ ہی کا نام ہے
اُمنگ ہی جو مٹ گئی تو زندگی تمام ہے

الٰہی! دل وہ دے کہ بات بات پر مچل سکے
الٰہی! دل وہ دے کہ رُخ زمانے کا بدل سکے

الٰہی! دل وہ دے کہ کارزار میں تو ہو نہ ہو
تڑپ تڑپ کے جان دوں پہ سر مرا نگوں نہ ہو

دُلہن

تو کہ بیٹھی ہے مسہری پہ لٹکا لے گھونگٹ
یوں نہ گردن کو جھکا لے مری پا کر آہٹ

نیچی نظروں سے ذرا دیکھ تو گھونگٹ کو اُلٹ
میں سناؤں تجھے مٹ جائے جو دم بھر تری ہٹ

سُن! دیا عشق و غمِ دہر کا پھندا تو نے
پھول دے کر مجھے کانٹوں میں گھسیٹا تو نے

چھوڑا بچپن نے ہمیں عقد کا تحفہ دے کر
سر پہ دستار بندھائی ہے تو سودا دے کر

کس مصیبت میں پھنسایا ہمیں دنیا دے کر
باب ابجد کا ہوا ختم تمنّا دے کر

آ نکالیں وہ عبارت کہ تھی دل میں ملفوف
آ کہ اب مل کے جڑیں عشق و محبت کے حروف

بھولی لڑکی تجھے معلوم ہے دنیا کیا ہے؟
گھاٹیوں سے کہیں دشوار گذر اس کا ہے

سر پہ ٹھلیا ہے، بڑی دور مگر چشمہ ہے
ساتھ میں بھی تو چلوں گا تجھے کیا پروا ہے

باندھ ہمّت وہ چٹانوں کو بھی جو نرم کرے
سردمہریِ جہاں اور بھی دل گرم کرے

سن مری موہنی اے سانولے مکھڑے والی
دل کے بہلانے کو خالق نے تھی مورت ڈھالی
میں تھا بے چین اکیلا مجھے یہ دے ڈالی
پھر تو وہ پیار کی باتیں ہو میں بھولی بھالی

سر بہ سجدہ ہیں مَلک جھوم رہی ہے فطرت
دیکھتا ہے ہمیں کس پیار سے ربّ العزّت

وجہِ تکوین بھی شاید ہوں یہی راز و نیاز
اپنی تخلیق ہے خالق کے لئے مایۂ ناز
زندگی جوڑ سے ہوتی ہے لچکدار و گداز
اس میں پوشیدہ ہے انسان کی تکمیل کا راز

اپنی الفت کو ہم اب زندۂ جاوید کریں
آکہ فردوس کے افراز کی تجدید کریں

اپنے سنسار کی دیوی میں بناؤں گا تجھے
لطف کی چھیڑ سے خوش ہو کے ہنساؤں گا تجھے
تو اگر روٹھے تو ہنس ہنس کے مناؤں گا تجھے
مجھے رونا ہو تو رو رو کے رلاؤں گا تجھے

ہم جو دنیا میں بہم مونس و یاور ہوں گے
عالمِ قدس سے پھر پھول نچھاور ہوں گے

سُورما

پشت پر ڈھال ہے اور زیبِ کمر تیز کٹار
ایک ناگن ہے ترے ہاتھ میں ننگی تلوار
وہ جیالا ترا گھوڑا ترے کس بل پہ نثار
کوئی دیکھے ترے اس رنگِ جوانی کا نکھار

تو ہے رنبیر تجھے رن میں مزا آتا ہے
ایک دلہا ہے کہ مقتل میں چلا آتا ہے

خوں چھلکتا رہے جس میں وہ ہے ساغر تیرا — موت کے منہ میں چمکتا رہا اختر تیرا
شوقِ شہرت میں مگر چھوٹ گیا گھر تیرا — حُسن والوں کے لئے وقف ہوا سر تیرا

نیم بسمل ہے شہیدِ نگہِ ناز ہے تو
سچ تو یہ ہے کہ فقط عاشقِ جانباز ہے تو

عشق نے بھیجا ہے میداں میں تجھے دیکے علم — حُسن کے در سے بڑھاتا ہوا آتا ہے قدم
جھونکے اُس ہمت کے رکھتے ہیں تجھے تازہ دم — تیرے خنجر میں عیاں ابروئے خمدار کا خم

تیرے قاتل کی نگاہوں کی ادا تیر میں ہے
آگ جو دل میں لگی ہے وہی شمشیر میں ہے

دے اماں جانوں کی یا زلزلہ ہلی ٹو کی ڈور — سایۂ تیغ کے دل ہیں کہ گھٹا ہے گھنگھور
جا پڑا تو تو اٹھا فوجِ مقابل سے شور — اک ترے دم سے لڑائی کے وہ طوفان کا زور

زخم کھاتے ہی وہ بل کھا کے بگڑنا تیرا
جوشِ مستی میں غضب جھومتے لڑنا تیرا

بیک بیک خیر منانے لگے تیری ملکوت — تیرے گر کر وہ تڑپنے پہ ہے لشکر مبہوت
بڑھ کے آتی ہیں شعاعیں کہ اٹھائیں تابوت — چھا گیا رزم کے بازار پہ دم بھر کا سکوت

ہیں نگوں سار علم محو ہوا چرخِ کہن
فاتحہ پڑھنے لگی تیرے لئے خاکِ وطن

ریل گاڑی

ہے اُس کا تڑپتا ہوا دل شعلۂ مضطر
شوریدہ سر ایسی کہ قیامت لئے سر پر

یا ابرِ سیہ ہے کہ گرجتا رہے پیہم
یا ہے دلِ صد چاک دھڑکتا ہے جو ہر دم

لو بانگِ جرس سن کے ہوئے ڈھنگ نرالے
چپ چاپ تھی اب پیٹ سے پاؤں اس نے نکالے

منظور ہوا کب اُسے اک جائے پہ رہنا
محور پہ چلی گھومتی چھوٹی سی یہ دنیا

مجنوں کی طرح صبح و مسا پھرتی ہے بن بن
کہسار پہ دیکھو تو ہے پھنکارتی ناگن

وہ کوہ سے اتری تو ترائی میں در آئی
کھیتوں سے گذرنے لگی، پُل سے اتر آئی

جنگل میں گھسی اور کلیلیں لگی کرنے
میدان میں آئی تو سپاٹے لگی بھرنے

دم بھر میں گذر جائے پرے دشت و جبل سے
رفتار میں ہے تیز قدم پیکِ اجل سے

یا خون کرے گشت کسانوں کی رگوں میں
یا نبض کرے جست جوانوں کی رگوں میں

صرصر ہو مقابل تو ہوا اس کی نہ پائے
یا دل جو رواں ہو تو یہ سایہ میں نہ آئے

نازک کمر ایسی کہ لچکتی رہے ہر دم
ہے سینہ لیے تاب میں اک کوہ کا دم خم

وہ شانِ دلاویزِ شجر اور حجر کی
گلکاریاں بھاتی ہیں مجھے شام و سحر کی

یہ دشت یہ گلگشت یہ وادی یہ فضا کیا
اک چین ہی حصّہ میں نہ آئے تو بھلا کیا

اس کشمکشِ دہر میں دلشاد ہے کتنی
یہ طوق و سلاسل میں بھی آزاد ہے کتنی

دُھن ایسی کہ اک بار جو ہو جائے رواں
پلٹے نہ یہ پھر چاہے پلٹ جائے زمانہ

ہر کام سلیقے سے جو کرتے ہیں جہاں میں
اک راہِ مفر سے گذرتے ہیں جہاں میں

یوں آہنی آثارِ عمل چھوڑ کے جاؤ
جو مٹ نہ سکیں نقشِ قدم ایسے جماؤ

برقی۔ ابوالفتح محمد نصراللہ بی۔اے (عثمانیہ)

[ان کا دماغ ریاضی داں ہے اور دل شاعرانہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری گو مشق سخن کی رہین منت نہیں لیکن ذوق اور خوبی کی حامل ہے۔ مزاج میں استغنا ہے کبھی کبھی زندگی پر ان کی ایک تلخ نظر پڑ جاتی ہے۔ فلسفے کو شاعری کے ساتھ عمدگی سے امتزاج دیتے ہیں۔ "فلسفیوں کی محفل" والی نظم اسکی شہادت ہے۔ اپنے شاعرانہ ماحول اور علم پرست خاندان کی وجہ سے ان کا مذاق سخن نکھرا ہوا بھی ہے اور زندہ بھی۔ لطافت خیال اور زبان سے اچھا کام لیتے ہیں۔ اگر یکسوئی کے ساتھ شاعری کی طرف مائل ہوتے تو بہت ترقی کر سکتے تھے]

شاعر کی پہلی دعا

الٰہی جلووں کی کثرت سے دامانِ نظر بھر دے
مری آنکھوں میں نور بینش شمس و قمر بھر دے

تجلی زار کر دے دل کو اپنی جلوہ باری سے
مرے اس خانۂ تاریک میں نورِ سحر بھر دے

مئے نو کو عطا کر کیفِ صہبائے کہن یا رب
دہانِ غنچۂ نوخیز میں لعل و گہر بھر دے

ترنم کا عطا کر کیف میری غم نوائی کو
مری آواز میں یارب مرادر دِ جگر بھر دے

پلٹ دوں دورِ گیتی کو الٹ دوں چرخِ گرداں کو
مرے پیمانہ میں ایسی مئے وحشت اثر بھر دے

بنیں جاں بخش مردوں کیلئے برقیؔ کے ہنگامے
زباں میں صورِ اسرافیل کا یارب اثر بھر دے

نقش و نگارِ طاقِ نسیاں

پیار کی باتیں لطف کے دن وہ محفلِ عشرت یاد نہیں
بھول نہ سکتے تھے جس کو وہ عہدِ مسرت یاد نہیں

مر مر کر پایا تھا جسے وہ گوہرِ ہستی کھو بیٹھے
جیتے تھے ہم جس کے لئے وہ دردِ محبت یاد نہیں

مستیٔ نرگس خواب سہی اور نکہتِ کاکل افسانہ
وہ خواب و فسانہ بھول گئے وہ کیف وہ حالت یاد نہیں

سنتے تو ہیں اے حضرتِ دل تھے آپ بھی زندہ اور ہم بھی
اب اپنا وہ عالم یاد نہیں وہ آپ کی صورت یاد نہیں

وہ دل ہی نہیں وہ دن ہی نہیں وہ درد نہیں وہ ذوق نہیں
وہ لطفِ شکایت بھول گئے وہ شوقِ حکایت یاد نہیں

مدت سے اے برقیؔ محزوں دل میں ہے سناٹا سا
وہ ذوقِ تپش وہ دردِ دروں وہ درد کی لذت یاد نہیں

دِل کی فریاد

گراں دیوارِ آہن اور کڑی پاؤں کی زنجیریں
ہیں صرفِ کوششِ ناکام میری ساری تدبیریں

اب اپنی ہستیٔ ناکام کی روداد کیا لکھوں
میں اس قیدِ فرنگِ عقل میں جینے سے عاجز ہوں

نہ مذہب میں دل آویزی نہ موسیقی میں غنا کی
نہ اب وہ حسن میں جادو محبت میں نہ وہ باکی

حسینانِ فلک تودے بنے ہیں سنگ و آہن کے
جوانانِ چمن دھوکے ہیں شنا یدِ چشمِ پُرفن کے

خدا میری عقیدت کی بنیں بے رنگ تصویریں
ہوئی ہیں حسنِ فطرت کی عجب بے کیف تعبیریں

محبت میں نہیں وہ روحِ انسانی شرافت کی
دمِ عاشق پہ ہیں پابندیاں عقل و سیاست کی

خداوندا یہ کب تک عقلِ پُرفن کی ستم رانی
لباسِ آدمی میں جلوہ گر ہے روحِ شیطانی

مجھے کچھ لطف اس دو دن کی دنیا کے اٹھا دینے
مجھے دھوکوں میں رہنے دے مجھے دھوکے ہی کھانے دے

الٰہی پھر عطا کر آدمی کو جہل کی برکت
کہ اس گستاخ کے ہاتھوں سے میری لٹ گئی راحت

اگر ناواقفیت باعثِ آرام عالم ہے
تو علم اسم اعظم بھی یہاں ایک اثم اعظم ہے

رخِ خورشید سے بادل کا یہ ہنگامہ چھٹ جائے
ضرورت ہے کہ پھر یونان کا طبقہ الٹ جائے

عبث ہونگی نجاتِ آدمی کی ساری تدبیریں
نہ جب تک محو ہوں سب صفحۂ عالم کی تحریریں

فلسفیوں کی محفل

[نوٹ۔ دنیا کے تمام فلسفی تسکین کے متلاشی ہیں جو انسان کو میٹھی نیند سلا دیتی ہے اقبال کا فلسفۂ حیات آفرین ہے سوتوں کو جگانے والا ہے۔ اس نظم میں مختلف فلسفیوں کے نظریات پیش کئے گئے ہیں اقبال کے فلسفۂ حیات میں دوسرے فلسفیوں کا ایک خدنگ زدیدی جواب بھی موجود ہے۔]

ابراہیم ادھم کا پیغام

اے زمزمہ سنجانِ طرب میری سنو کچھ
اے نوحہ سرایانِ الم مجھ سے کہو کچھ

ہاں میری نصیحت سے خبر ہو کے نہ ہو کچھ
ہاں میری تسلّی کا اثر لو کہ نہ لو کچھ

دنیا کو سرا ایک اتر پڑنے کی جانو
اک بات ہے حق کی اسے مانو کہ نہ مانو

اس ہستیِ فانی کی بہاروں پہ نہ جانا
اس گلشنِ خوش رنگ کے دھوکوں میں نہ آنا

دو روز کی دنیا کا یہ رنگیں ہے فسانہ
گو عیش کی ہستی ہے نہ کچھ غم کا ٹھکانہ

ہر رنگ کو گردش ہے طرب ہے کہ الم ہے
پایندہ بس اک دور تغیر کا علم ہے

کس بات پہ بھولا ہوا اس باغ میں تو ہے — ہنستی نہیں تیری گل خوش رنگ کی بو ہے
اک قطرۂ شبنم ہے جو خورشید بہ رو ہے — یا ٹوٹنے والا تو حباب لب جو ہے

دو دن کی بہاروں سے نہ دل اپنا لگاؤ
صدمے سے خزاں کے نہ پھر اس دل کو دکھاؤ

اس دار کے دیوار سے ہٹ گنبد و در چھوڑ — اس باغ کے گل چھوڑ شجر چھوڑ ثمر چھوڑ
یہ سیم دغل چھوڑ زر و لعل و گہر چھوڑ — یہ فتنہ و شر چھوڑ زن و دختر و پسر چھوڑ

تنہائی میں کر بیٹھ کے حل راز نہاں کا
شاید کھلے جنگل میں طلسمات جہاں کا

—۲—

پیام عمر خیام

ہیں راز بڑے دہر پر افسوں کے پرانے — حل کر نہ سکے جن کو حکیم اور سیانے
کچھ ساقی و مطرب کے سنا یار فسانے — کم وقت ہے دو چار تو خم دے کے لنڈھانے

اس ذکر کے سننے کی نہیں ہے مجھے فرصت
جو دم کہ گزرتا ہے غنیمت ہے غنیمت

آئینہ صفت زنگ سے تیور پہ نہ بل آئے — دل صورت گل خار کی کاوش ہی سے کھل جائے
مانا کہ یہ دنیا ہے مصائب کی فقط جائے — رکھ عیش پہ دل ڈھونڈنے سے غم نہ جیسے پائے

رہ صورت پیمانہ تو مخمور مسرت
اور عیش کی دے داد جو گردش میں ہو قسمت

خدام ہیں تیرے زسما تا بہ سمک دیکھ | جو گوشیہ میں افسر شاہی کی دمک دیکھ
ہے خاک نشیں تو مگر انوارِ فلک دیکھ | تاریکی شب میں مہ و انجم کی چمک دیکھ

اس عقلِ الم کوش کو ساغر میں ڈبو دے
سب کلفتِ دیرینہ بس اک جرعہ میں دھو دے

۳

ویدانتی کا فلسفہ

کچھ پوچھ نہ اے دوست کہ کیا راز ہے عالم | اک خواب مسلسل ہے نظر آئے جو پیہم
تصویر خیالی ہے جو کچھ دیکھتے ہیں ہم | یا عکسِ تصور کہ جو ہو درہم و برہم

ہم دیکھتے ہیں اپنے تصور کے اثر کو
یہ اصل حقیقت ہے کہ دھوکہ ہی نظر کو

اس مزرع بے بود میں بویا بھی تو پھر کیا | اس بازی بے سود میں کھویا بھی تو پھر کیا
اس غمکدۂ وہم میں رویا بھی تو پھر کیا | اس عالمِ تصویر میں سویا بھی تو پھر کیا

اس خرمنِ بے اصل کا حاصل تو ہے معلوم
پھر تو ہی بتا رنج و تعب کا ہے مفہوم

۴

اقبال کی دعوتِ عمل

انسان جو اس بزم کا اک رکنِ رکیں ہے | جو اشرف مخلوقِ سماوات و زمیں ہے
مسجودِ ملک کنگرۂ عرشِ بریں ہے | کیا اپنے فریضہ سے وہ آگاہ نہیں ہے

معیارِ شرف گنجِ قناعت نہیں اس کا
مقصودِ اتم رنج و مسرت نہیں اس کا

بلبل کے لئے ہے کہ کرے نغمہ شعاری
تو شمع صفت کرتا ہے کیوں گریہ و زاری؟
تو گوشۂ عزلت میں کرے عمر گذاری!
جو کام کہ کرنے ہیں تجھے کام ہیں بھاری

مقصود تری زیست کا ہے ارفع و اعلیٰ
رتبہ ترا کیوں جن و ملائک سے ہے بالا؟

یہ عمر جو ہر لحظہ و ہر دم گزراں ہے
لاریب کہ قبضہ میں ترے نقد رواں ہے
اک آگ تری ہستیٔ فانی میں تپاں ہے
اک شور ترے قلب میں ہنگامہ کناں ہے

للکار ہے جس کی کہ بڑھے جا تو جہاں میں
ہے جذب قیامت کا اس آواز نہاں میں

اے نیند کے ماتے تو ذرا اٹھ کے سنبھل دیکھ
ہے تاک میں ہر ایک! یا ہیچ کی اجل دیکھ
اس ذہن کے زنداں سے نکل اور تو چل دیکھ
گر خواب تری زیست ہے تو خواب عمل دیکھ

سب خوابوں سے دلکش ہے یہ بہت خواب ترقی
تو کھولتا جا خواب میں ابواب ترقی

ہر شکل ہے کھولے ہوئے آغوشِ ترقی
ہر سینہ میں ہے موجزناں جوششِ ترقی
صوفی ہے بڑا سب سے قدح نوشِ ترقی
ہوشیاروں سے ہوشیار ہے مدہوشِ ترقی

ہے صاف عیاں حاجتِ اظہار نہیں ہے
قدرت کا عطیہ کوئی بیکار نہیں ہے

محکوم بنا بھاپ کو اور برقِ تپاں کو — محسوس بنا مشل مکاں بُعدِ زماں کو
جا ڈھونڈ لے مریخ میں اسرارِ جہاں کو — لا توڑ کے افلاک سے انوارِ رواں کو

ہے فیض یہ نفسِ تپش آمادہ کا تیرے
تسکیں کے لئے جان ہی خود اپنی نہ دیدے

جذبہ[1] جو یہ بخشا ہے عنایت ہے خدا کی — ہاں اس کی کریں قدر کہ نعمت ہے خدا کی
سینوں میں ہمارے یہ ودیعت ہے خدا کی — ہرگز نہ تلف ہو کہ امانت ہے خدا کی

میدانِ ترقی میں قدم اپنے بڑھائیں
اس نعمتِ عظمیٰ کو چلو کام میں لائیں

غزلیں

کچھ نہیں دل میں سوائے دردِ دل — دل ملا ہم کو برائے دردِ دل
دوست ہیں نامحرمِ اسرارِ عشق — آشنا نا آشنائے دردِ دل
یار ہے ناواقفِ رمزِ وفا — اب کوئی کسکو سنائے دردِ دل
دیر اتنی چارہ سازی میں حضور — سم نہ بن جائے دوائے دردِ دل
شامِ غم کوئی نہ تھا جب غمگسار — یاد ہے ہم کو وفائے دردِ دل
کس کو ہے ذوقِ سرودِ سازِ غم — کون سنتا ہے نوائے دردِ دل

اک نہیں تم ہی شکارِ تیرِ غم
سب ہیں برقیؔ مبتلائے دردِ دل

---

[1] جذبہ سے جذبہ ترقی مراد ہے جو ہر انسان کے سینہ میں فطرتاً ودیعت ہے۔

کسی کا لیکے دل اس طرح کوئی بے خبر کیوں ہو — غرورِ حسن تو زیبا ہے لیکن اس قدر کیوں ہو
الٰہی وصل کی شب ہے ذرا انصاف تو کرنا — ہوئی جب شام برسوں میں تو لمحوں میں سحر کیوں ہو
اسے رہنے بھی دے بادِ صبا کوئے تمنا میں — غبارِ عاشقانِ باوفا ہے دربدر کیوں ہو
نگاہِ ناز سے یوں دیکھنا تیرا نہیں اچھا — مری حیرانیوں کا آئینہ تیری نظر کیوں ہو
گراں ہیں میرے نغمے بھی کسی کی طبعِ نازک پر — مری فریاد میں یارب مرا دردِ جگر کیوں ہو

تجھے لپکا ہی برقی پڑ گیا ہے جبہ سائی کا
بہت سے اور ہیں کم بخت گھر میرا ہی در کیوں ہو

ہے جوش سے خونابہ فشاں دیدۂ تر آج — بچتا نظر آتا نہیں پہلو میں جگر آج
گل رنگ جہاں دیکھئے کیا رنگ دکھائے — خنداں نظر آتا ہے چمن میں گلِ تر آج
یہ ولولہ انگیز سماں اور یہ موسم — توبہ مجھے اب اپنی ہے تسلیم مگر آج

آرام ہوا برقی آشفتہ کو شاید
سونی نظر آتی ہے تری راہ گزر آج

عمر کا رشتہ جلا کر دل کے ساتھ — اٹھ گئے ہم شمع ساں محفل کے ساتھ
ہم ہوئے آزاد او پیماں شکن — رشتۂ امید ٹوٹا دل کے ساتھ
لیلیٰ مقصود کیا ہاتھ آگیا — گو چلا تو دو قدم محمل کے ساتھ

وضع داری کا برا ہو بحر بر
رہ گئے ہم خشک لب ساحل کے ساتھ

خوشبو نسیم لاتی ہے گر زلفِ یار سے
بچ کر نکل ہی جاتی ہے میرے مزار سے

آزاد ہوں اگرچہ اسیرِ قفس ہوں میں
تکلیف ہے خزاں کی نہ راحت بہار سے

حالِ چمن طرازیِٔ دامن نہ پوچھئے
جاری ہے خونِ دل مژۂ اشکبار سے

حزیں - محمد شعیب بی۔اے (عثمانیہ)

[شوخ مزاج ہیں اور ادا کار ہیں۔ نظموں سے زیادہ غزل کی رنگین دنیا میں نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ ادائے خیال میں ایک بانکپن ہے۔ حسن وعشق میں گم ہونا جانتے ہیں لیکن ان کی گم شدگی بے معنی نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں آشیانوں میں بیٹھ کے برق اور طوفان سے اس طرح کھیلتے ہیں کہ زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں کھچ جاتا ہے۔ طرز ادا کی بے تکلفی اور سلجھی ہوئی ترکیبیں ان کی غزل گوئی کی جان ہیں]

یادگار رات

سنہری گرمیوں کی رات تھی، خاموش تھی دنیا — پیام حسن سننے کو سراپا گوش تھی دنیا
مگر خاموشی کامل میں اک کیف ترنم تھا — ادھر فطرت کے ہونٹوں پر نمایاں اک تبسم تھا
مہ کمسن کے نازک ہاتھ میں زریں پیالہ تھا — زمانہ بھر میں حسن بے مستیوں کا بول بالا تھا
فلک سے نور گرتا تھا زمیں پر چاندنی بنکر — برستا تھا دل عالم پہ کیف بے خودی بنکر
یکایک ایک نالے نے یہ کیفیت بدل ڈالی — سکوت شب کی وہ نازک کلی گویا مسل ڈالی
کسی نے آہ کھینچی حسن کی خاموش محفل میں — کسی نے جوگ چھیڑا رات کی مدہوش محفل میں
بلا کا درد تھا لے میں غضب کا سوز پنہاں تھا — فضا کی وسعتوں میں ایک شعلہ سا پریشاں تھا
جو بالکل بے خبر تھے وہ ستارے تلملا اٹھے — جو ذرے سو رہے تھے وہ بھی سارے تلملا اٹھے
خلا میں کھو گئی آواز تھراتی ہوئی غم کی — بھیانک رہ گئیں خاموشیاں فضائے عالم کی

مرے دل میں مگر وہ دُکھ بھری فریاد ہے اب تک
وہ غم انگیز لَے وہ جوگ مجھکو یاد ہے اب تک

غزلیں

نئے انداز ہیں صیاد تیرے دل جلانے کے
قفس پر لا کے تنکے ڈالتا ہے آشیانے کے

فلک کیا خون کے چھینٹے ہی غفلت دور کرتے ہیں
طریقے کیا یہی ہوتے ہیں سوتوں کو جگانے کے؟

جو پوری سانس لی تھی عفو کر اے مالکِ زنداں
ابھی واقف نہیں ہوں قاعدوں سے قید خانے کے

کرم اس کو سمجھ بیٹھا یہ دل کی سادہ لوحی تھی
نگاہِ بے تکلف میں تھے پہلو آزمانے کے

قفس نے سارا کس بل لے لیا اے ذوقِ آزادی
وہی انداز ہیں لیکن ابھی تک پھڑپھڑانے کے

ابھی کچھ التفاتِ برق کے سامان باقی ہیں
ابھی دو چار تنکے بچ رہے ہیں آشیانے کے

کسی کے نقشِ پا کا تھا تقاضائے جبیں یونہی
وگرنہ ہم سے خود دار اور مجرم سر جھکانے کے

ہمیشہ نیند سے کچھ پہلے آنکھوں میں سما جانا
طریقے آپ سے سیکھے کوئی شب بھر جگانے کے

یہ کالے کالے بادل ننھی ننھی بوندیاں توبہ
حزیں فطرت ارادے کر رہی ہے مے پلانے کے

— ۲ —

چینِ جبیں کے ساتھ ذرا مسکرا کے دیکھ
ربطِ نیاز و ناز کو خوب آزما کے دیکھ

نظارۂ جمال کی لذت بڑھا کے دیکھ
جلوے کے انتظار کی زحمت اٹھا کے دیکھ

ہر کیفیت کو کیفِ محبت بنا کے دیکھ
ہاں انتہائے یاس میں بھی مسکرا کے دیکھ

ق

صبرِ دلِ غریب کو خوب آزما کے دیکھ
سعیِ تمامِ عمر کا حاصل مٹا کے دیکھ

ہم بھی تماشا جان کے دیکھینگے آسماں — ہاں ہاں ہر ایک تنکے پہ بجلی گرا کے دیکھ
عالم تمام صرفِ تبسم نہ ہو تو کہہ — تو نیند کے خمار میں کچھ مسکرا کے دیکھ

یہ بے خودیِ عشق ہے یا بے حسیِ موت
قلبِ حزیں میں اک ذرا نشتر چبھا کے دیکھ

۳

اگر حزیں کہیں شرمندۂ فغاں ہوتا — تو سچ کہوں کرمِ عشق رائگاں ہوتا
بھری بہار میں گلشن کو آگ لگ جاتی — جو بجلیوں کی نظر میں نہ آشیاں ہوتا
نگاہ خیرہ، زباں بند، ہوش گم، توبہ! — وہ بے حجاب نہ ہوتے تو کچھ بیاں ہوتا
ہمارے ذوقِ تباہی نے لاج رکھ لی ہے — یہ برق برق نہ ہوتی جو آشیاں ہوتا

حزیں کا دل تو خلش آشنا سکوں دشمن
کرم بھی آپ جو کرتے تو رائگاں ہوتا

۴

اجازت ہو تو تیرا کیں ہم آسماں سے کھیلیں — گرا کر آج اپنے آشیاں پہ بجلیاں کھیلیں
چلو یوں ہی مرے ذوقِ خلش کی داد مل جائے — مجھے تڑپا کے کھیلا چاہتے ہیں وہ جہاں کھیلیں
توجہ سارے گلشن سے ہٹا دی آسمانوں کی — یہ تنکے رکھ دئے ہیں تاکہ ان سے بجلیاں کھیلیں
مری بربادیاں ممنون ہیں صرف اس تمنا کی — کہ میں ان بجلیوں سے اور مجھ سے بجلیاں کھیلیں
اسی حیلے سے شاید مشقِ دل سوزی بھی ہو جائے — ہمارے آشیاں سے اور کچھ دن بجلیاں کھیلیں

حزیں میں کھیلتا ہوں جوشِ طوفان و تلاطم سے
مری کشتی سے موجیں کھیلنا چاہیں تو ہاں کھیلیں

۵

خونِ دل سے ابتدائے داستاں سمجھا تھا میں — اپنی بربادی بہ ظرفِ آسماں سمجھا تھا میں
ایک نالہ ایک آنسو ایک آہِ جانگداز — بس انھیں کو کائناتِ داستاں سمجھا تھا میں
برق کے قربان بربادی نے آنکھیں کھول دیں — چار تنکوں پر مدارِ آشیاں سمجھا تھا میں
دادِ الفت مل چکی بس اے تغافل کیش بس — بے نیازی کو بہ طرزِ امتحاں سمجھا تھا میں
آہ ترغیبِ تمنّا کا کسے الزام دوں؟ — اس نگاہِ مست کے تیور کہاں سمجھا تھا میں

آنکھ سے آنسو نکل آئے قفس سے چھوٹ کر
یعنی آزادی نصیبِ دشمناں سمجھا تھا میں

۶

اقرارِ ظلم کر لیں اور پھر بھی مسکرائیں — میں سب سمجھ رہا ہوں جی بھر کے آزمائیں
وہ وقت ڈھونڈتی ہیں پھر عشق کی ادائیں — میں گیسوؤں سے کھیلوں اور آپ گنگنائیں!
ہم اپنے آشیاں کو خود پھونک ڈالتے ہیں — بیکار بجلیاں کیوں یہ زحمتیں اٹھائیں
دل برق آشنا ہے سو بار جل چکا ہے — ہاں آپ مسکرائیں بے خوف مسکرائیں
پھر دل میں جیسے بجلی کروٹ بدل رہی ہے — کہدو کہ دونوں عالم اپنی حدیں بچائیں
مجبور تھے کہ نظریں خود نالہ بن چکی تھیں — اظہارِ غم کی ورنہ ہم تہمتیں اٹھائیں؟

شاید حزیں انہوں نے رُخ سے نقاب اُلٹا
پُرکیف ہیں فضائیں مخمور ہیں ہوائیں

۷

بیداد پسندی حد سے بڑھی تقدیر پہ شاکر رہ نہ سکے
ظلم انھیں کرنا ہی نہ آیا لطف و کرم ہم سہہ نہ سکے

کہتے بھی تو رو رو کر کہتے اور داد نہ ملتی کہنے کی
اچھا تو ہوا افسانۂ غم تم سُن نہ سکے ہم کہہ نہ سکے

باغ سے کچھ لینا تو نہ تھا، دو سوکھے تنکے رکھے تھے
اللہ رکھے اِس بجلی کو وہ بھی تو سلامت رہ نہ سکے

اِس ضبط کے ہاتھوں جی بھر کے رو بھی نہ سکے ہم اے توبہ
آنکھوں میں جو آنسو بھر آئے، پلکوں سے ڈھلک کر بہہ نہ سکے

بھیگی پلکیں، ہونٹ لرزتے، نظریں پریشاں، ہائے ستم
اِس طرح سے پوچھی حالتِ دل، ہم رو تو دئے کچھ کہہ نہ سکے

دل پہ کسی نے مُہر لگادی ہونٹ کھلے تو کیا حاصل
کہنے کو بہت کچھ کہتے رہے جو کہنا چاہا کہہ نہ سکے

ہم تو حزیںؔ یہ سمجھے ہیں دامن جو بھگو دے پانی ہے
آنسو تو وہی اِک قطرہ ہے پلکوں پہ جو تڑپے بہہ نہ سکے

۸

کس کو خبر تھی حاصلِ کاہش ایسا رلا دیکھینگے
شاخِ نشیمن کو اپنی آنکھ سے جلتا دیکھینگے

اے ذوقِ طلب ہمت کرلے کچھ بڑھ کے الٹ دے پردے کو
جلتے ہیں دو عالم جل جائیں ہم آج تو جلوہ دیکھینگے

کچھ کیفِ سکوں تو حاصل ہے جلوہ نہ سہی دھوکا ہی سہی
ہاں اور فریبِ تصور کا کچھ دیر تماشا دیکھینگے

پھر دل کو کسی نے چھیڑ دیا جذبات کی دنیا جاگ اٹھی
ہم جسکو ابھی بھولے بھی نہیں کیا پھر وہ تماشا دیکھینگے

بھولی ہوئی باتیں ہیں جب وہ زندہ دل تھا زندہ تھا
اب تو حزیںؔ کو آپ ہمیشہ کھویا کھویا دیکھینگے

ذکی۔ محمد عبدالسلام بی۔اے۔ ٹی۔ڈی (عثمانیہ)

شعر سے انھیں بہت محبت ہے اور اسی یکطرفہ محبت کی وجہ سے مشقِ سخن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ان کی شاعری نکھری نہ تھی کہ یہ بچوں کی دنیا میں چلے گئے۔ اس سے جب طبیعت اکتا جاتی ہے تو بڑے بوڑھوں کی محفل میں آکر دادِ سخن حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں خیال کی رنگینیاں مزا دے جاتی ہیں۔ بچوں کیلئے بعض انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے جو خوب ہے

حمد

نورِ خدا سے نور ہے من میں ۔۔۔ بستی بسائی جس نے تن میں
رونق جس سے ہر اک بن میں ۔۔۔ زینت ہے دنیا کے چمن میں

داتا کرپا ہم پر کر دے
علم و عمل سے جھولی بھر دے

اللہ پیارا نام ہے تیرا ۔۔۔ اسم مبارک رام ہے تیرا
وحدت کا پیغام ہے تیرا ۔۔۔ کیسا اچھا کام ہے تیرا

داتا کرپا ہم پر کر دے
علم و عمل سے جھولی بھر دے

بیکس جاں کا تو ہی سہارا ۔۔۔ غمگیں دل کا تو ہی مدارا
تو ہی سب کی آنکھ کا تارا ۔۔۔ سب کی ناؤ کا کھیون ہارا

دانا کرپا ھسم پر کر دے
علم و عمل سے جھولی بھر دے
اندھے کو تو بینا کر دے　　زندے کو تو مردا کر دے
مردے کو تو زندا کر دے　　چشمِ زدن میں کیا کیا کر دے
دانا کرپا ھسم پر کر دے
علم و عمل سے جھولی بھر دے

مدحِ نبی صلعم

مدحِ شاہِ حجازؐ کرتا ہوں　　اپنی قسمت پہ ناز کرتا ہوں
شاہ محمود ہیں تو بندہ ایاز　　آج افشائے راز کرتا ہوں
عشقِ احمدؐ میں ہر نفس اپنا　　وقفِ سوز و گداز کرتا ہوں
زندگی کر کے نذرِ عشقِ نبیؐ　　زیست کو سرفراز کرتا ہوں
کارسازی کا وقت آپہنچا　　عرض اے کارساز کرتا ہوں
میں یہ کرتا ہوں شرحِ روئے نبی　　یا کہ قرآن باز کرتا ہوں
کر کے پامالِ راہِ عشقِ نبی　　دل کو میں سرفراز کرتا ہوں
دمبدم کر رہا ہوں وردِ درودؐ　　یا ادائے نماز کرتا ہوں
اے صبا کہہ دے تو محمدؐ سے　　عرضِ عجز و نیاز کرتا ہوں
عشقِ احمدؐ میں طول دے دے کر　　قصۂ غم دراز کرتا ہوں
دل کا آئینہ گو ہے چور ذکی　　نذرِ آئینہ ساز کرتا ہوں

طلسمِ زندگی

طلسمِ رازِ زندگی سراب ہے نہ خواب ہے — نہ آگ ہے نہ باد ہے نہ خاک ہے نہ آب ہے
حیات ہے بہار کی نہ زندگی شرار کی — بہار ہے نہ عارضی حیاتِ مستعار کی
یہ زندگی ہے اِک عطا خدائے کردگار کی — ہے جنسِ بے بہا یہی تو گنجِ روزگار کی

ہے قدرِ زیست منحصر قوائے کارساز پر — ہزار سالہ عمر پر نہ عرصۂ دراز پر
تلاشِ دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے — یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے
وفا و مہر زیست میں بجائے قہر چاہیے — حیات کے محیط میں کوئی تو لہر چاہیے

ذکی پیام دل ہے یہ ہو پاک سازِ زندگی
قیودِ ننگ و نام سے ہو بے نیازِ زندگی

تیتری

حُسنِ فطرت کی مجسّم نازکی — واہ کیسی خوشنما ہے تیتری
چھینٹ کا ہے قدرتی اسکا لباس — دور سے دیکھو نہ جاؤ اسکے پاس
ہیں پروں سے نقشِ گوناگوں عیاں — صانعِ قدرت کی ہیں گلکاریاں
کیوں پکڑ کے اسکو تم کرتے ہو تنگ — ہاتھ لگنے سے اڑے گا اسکا رنگ
اسکے پیچھے دوڑنا اچھا نہیں — اِس کو دق کرنا تمھیں زیبا نہیں
اِس سے زینت ہے تمھارے باغ کی — یعنی رونق ہے یہ گل کے داغ کی
برگِ گل کا رس اسے پینے بھی دو — مت ستاؤ تم اسے جینے بھی دو

کیسے کیسے اچھے رنگ ہیں ‌‌‌‌ مانی و بہزاد بھی یاں دنگ ہیں
شاخِ گل پر ہے ہوا میں ہے کبھی ‌‌ گہہ زمیں پر ہے فضا میں ہے کبھی
لاکھ اداؤں سے اڑا کرتی ہے یہ ‌‌ ہر طرف ہر دم مڑا کرتی ہے یہ
تتلیوں کے ساتھ ہے تنہا کبھی ‌‌ ہے کبھی پیشِ نظر عنقا کبھی
بزمِ گل میں رقص کرتی ہے سدا ‌‌ تو نے آخر کس سے سیکھی یہ ادا؟
ناچ وہ جس سے ہر اک حیران ہے ‌‌ جس پہ کل اندر سبھا قربان ہے
بھولی بھالی ناز پرور نازنیں
دلربائی میں کوئی تجھ سا نہیں

غزلیات

وہ تصور میں مرے آکر ہنسے ‌‌ لو ہنسے اور پھول برسا کر ہنسے
گدگدایا جب نسیمِ صبح نے ‌‌ شکلِ غنچہ رنگ برسا کر ہنسے
مانندِ پھولوں کا تبسم پڑ گیا ‌‌ جب کبھی وہ باغ میں جا کر ہنسے
رو پڑے پہلے تو میرے ذکر پر ‌‌ اور پھر کچھ یاد فرما کر ہنسے
تار ہائے سازِ ہستی چھیڑ کر ‌‌ زلف کی مانند بل کھا کر ہنسے
آئی کیا لب پر تبسم کی جھلک ‌‌ برق کی مانند تڑپا کر ہنسے
ماجرائے دردِ فرقت اے ذکی
لب تک آیا تھا کہ شرما کر ہنسے

۲

احساسِ دردِ عشق نے انساں بنا دیا | صد گونہ مشکلات کو آساں بنا دیا
میں کیا بتاؤں اس بتِ کافر کے عشق نے | کافر بنا کے عین مسلماں بنا دیا
مسحور کر دیا ہے یہ عکسِ جمال نے | یا آئینے نے آپ کو حیراں بنا دیا
قرباں خیالِ یار کے جاؤں ہزار بار | جس نے کہ قرب و بعد کو یکساں بنا دیا
طے رفتہ رفتہ کی ہیں مظاہر نے منزلیں | کیا دفعتہً ہی عالمِ امکاں بنا دیا
بخشا خدا نے آدمی کو زورِ کائنات | اک مورِ ناتواں کو سلیماں بنا دیا

مٹ کر طریقِ مہر نے اس دہر سے ذکیؔ
دنیا کو ایک قالبِ بے جاں بنا دیا

۳

وہ نگہہ کارگر نہ ہو جائے | دل شکارِ نظر نہ ہو جائے
ڈر ہے جادوئے گفتگو سے ترے | ہم زباں نامہ بر نہ ہو جائے
اِس ادا سے نہ دیکھ آئینہ | تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
شکوۂ بخت کیا سمجھ کے کروں | کہیں اُس کو خبر نہ ہو جائے
آپ کی راہ میں کوئی پامال | صورتِ رہگزر نہ ہو جائے
دن تو یادِ رُخ و اضطراب کٹا | روتے روتے سحر نہ ہو جائے

اے ذکیؔ چھوڑ خبطِ عشقِ بتاں
زندگی دردِ سر نہ ہو جائے

۴

ہے شیرینی یہ کس شیوا بیاں کی
حلاوت بڑھ گئی کچھ داستاں کی

ہوں وہ محوِ خیالِ روئے جاناں
کہ اب پروا نہیں دونوں جہاں کی

کبھی کچھ ہے کبھی کچھ رنگِ عالم
یہ گردش ہے زمین و آسماں کی

خبر بھی ہے کچھ اے دیوانۂ عشق
کہاں تک بات جا پہنچی کہاں کی

ابھی سے دعوئے تکمیلِ الفت
ابھی کڑیاں ہیں باقی امتحاں کی

"نہیں" سے مارنا "ہاں" سے جلانا
کرامت ہے ذکیؔ ان کی زباں کی

رشدی۔ محمد حبیب اللہ۔ ایم۔ اے (عثمانیہ)

[ایک شاعر خواب و تصور ہیں۔ خوش رنگ تشبیہوں سے اپنے خیال کا سنوارنا ان کا مسلک ہے۔ دشتِ خیال میں ایک روح کی طرح آوارہ گرد اور اپنے گیتوں کی ظاہری آرائشوں سے بے نیاز۔ شعر نغمہ بن کے نکلتا ہے اور اپنے لئے وہ سانچے اختیار کر لیتا ہے جو خود طبیعت بنائے۔ کبھی اپنے جذبۂ شعر کو تسلی دینے کیلئے ترجموں سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شعر کی دیویوں نے انھیں اپنی بزم سے دور کر دیا یا شاعر "خود غرض مزدور" بننے کیلئے بزم شعرا کو الوداع کہہ گئے۔ "حسن ملیح" اور "نمود صبح" میں ان کے جذبات کی تازگی لطف اٹھانے کی چیز ہے]

نمود صبح

کِھلا ہوا تھا کنول شبِ مہ کا اب تو افسردہ ہو رہا ہے
ہے باغ پر بے خودی سی طاری حسین چشمہ بھی سو رہا ہے
قمر کا چہرا اُتر گیا ہے چراغ تاروں کے بجھ رہے ہیں
وہ شب کے مہمان طائرِ شب خموش بادل پہ اڑ چلے ہیں
تمام شب ماہ نے اڑائی چمن پہ اِک موتیا کی چادر
وہ ڈوبتا جا رہا ہے اب تو فلک پہ موجِ شفق کے اندر
چراغ رکھے بجھے رہ گذر پر تمام شب شاخ نارون نے
نسیم کے نرم نرم جھونکے اب اُن کو آہستہ گل کریں گے

ہوا کے طوفاں نے زور باندھا کہ رُوحِ شاعر لرز رہی ہے
کچھ اس طرح سرو ہل رہا ہے کہ نازنیں اک مچل گئی ہے
صدا یہ خاموش کیسی آئی کہ جس کو اس قلب نے سُنا ہے
دہانِ غنچہ نے راز شاید سحر کے کانوں میں کچھ کہا ہے
سحر کا تارا پیام لایا ہے کس حسیں کے فروغِ رُخ کا
کہ میرے فانوسِ دل میں روشن اُسی کی اُلفت کا داغ ہوگا
وہ محو ہے خوابِ ناز ہی میں، فروغ یہ جس کے حُسن کا ہے
یہ کون بولے حضور اُٹھئے کہ دستِ خورشید بڑھ رہا ہے

حُسنِ ملیح

یوں تو ظاہر میں صباحت نہیں چہرے پہ ترے
نہ فروزاں ہیں ترے گوش میں دُرِ شہوار
اور نہ تو اور بشاشت نہیں چہرے پہ ترے
حُسن کے واسطے سنتے ہیں کہ ہیں سولہ سنگار

بزمِ عالم میں حسیں دیکھے تھے لاکھوں میں نے
لیکن اتنا تو کسی سے بھی مجھے ربط نہ تھا
بات یہ کیا ہے کہ آنکھیں نہیں ہٹتیں تجھ سے
تجھ میں وہ کونسا جادو ہے بھرا یہ تو بتا؟

کیا حیا ہے تو کہ آئی ہے مجسّم ہو کر
یا اک آوازِ حزیں ہے کہ بنی ہے انساں
کیا کوئی حُور ہے جو آئی ہے جوگن بن کر
راکھ مل کر ہے کیا حُسن کو اپنے پنہاں

یا کوئی رُوح ہے تو آئی ہے جو ہو کے خفا — جو کسی پیکرِ نازک میں تھی پابندِ قیود
کیا سبب ہے تری افسردگی دل کا بتا — کیوں چمکتا ہے کثافت میں ترا رنگِ وجود؟

گرچہ ملتا ہے نمائش ہی سے ہستی کا پتا — ذرہ ذرہ کی چمک سے ہے قیامِ عالم
تو مگر چہرے سے پردہ نہ ملاحت کا ہٹا — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ جل جائے نظامِ عالم

قیامِ سلطنتِ آصفیہ

طوفاں مچا ہوا تھا دُنیائے ہند میں جب
گلشن کے ہر شجر پر آفت ہوئی تھی نازل
مغرب کے باد و باراں یلغار کر رہے تھے
سارا چمن ہمارا وقفِ خزاں ہوا تھا
اِک پیر مردِ غازی سُن کر صدا خزاں کی
اٹھا اور اُس نے اٹھ کر دیکھا فلک کی جانب
دورِ فلک میں دیکھی تصویر عہدِ نو کی
مالی تھا وہ چمن کا، تھی اُس کے دم سے رونق
دیکھی خزاں جو اُس نے پیارے وطن کو چھوڑا
چھوٹی سی ناؤ لے کر نکلا وہ نوحِ ثانی
اور دُور جا کے اُس نے ڈھونڈھا نیا جزیرہ

ڈوبا جہاز جس دم ملاح سارے ڈوبے
غوطے بہت سے کھائے اور چل بسے بہت سے
رحمت خدا کی تجھ پر اے پیر مرد غازی

رخصت شباب

کھیل رہی تھی زندگی تیری طفولیت میں گیا
عالم آب و گل ترا جلوۂ برق تاب تھا

تیرا تخیل آفریں خواب بہت طویل تھا
طائر گلشن ارم مست بنا اڑا کیا

دست شباب نے ترے نوچ لئے جو بال و پر
عالم اضطراب میں ضبط ہی کام آگیا

بے کسی حیات میں عشق نے پالیا تجھے
نے کی صدائے مست نے حکم قضا سنا دیا

حسن کی زرد چاندنی ایک پری کی چھاؤں تھی
طائر بام قدس کو باغ جہاں پسند تھا

منزل عشق طے ہوئی ختم ترا شباب ہے
عقل کا عہد دور میں تجھ کو ہے اب بلا رہا

سر سے اتار شاہ عشق اب تو یہ تاج گوہریں
بندۂ خاکسار بن چھوڑ دے تخت مرمریں

شہر گوہریں
(حیدرآباد دکن)

اے گل رنگیں، عشرت کے مکاں میرے وطن
تو مرے فکر و تخیل کی ہے اک کان عدن

میرے دل میں تیری الفت کا ہی جو طوفاں بپا
آہ ہو سکتا نہیں کوئی بھی اس سے آشنا

ترجمہ از نظم مسز سروجنی نائیڈو۔

حُسن و خوبی ہے ترے دل میں جو فطرت نے بھری
ہاں اُسی چشمہ سے میری زندگی پیدا ہوئی

کیا یہ میرا جسم پتلا خاک کا تیری نہیں؟
کیا تری پاکیزہ مٹی سے مری مٹی نہیں؟

زندگی کے نخل نے میرے نہیں پائی ہے کیا
تیرے چشموں کے مُصَفّا آب سے نشو و نما؟

کیا ترے صحرا میں سحر آگیں بہاروں نے کبھی
اپنی فکر انگیز رونق سے مجھے لوری نہ دی

آہ اب میں گرچہ اک تکلیف دہ غربت میں ہوں
اور آوارہ بہت تیرے غمِ فرقت میں ہوں

پھر بھی کیا میرے دلِ محزوں کا تو معبد نہیں!
جستجو تیرے لئے کیا رُوح کا مقصد نہیں!

یادِ ماضی

سحر کا نُور اور پھر چہچہانا پیاری چڑیوں کا
گلوں کا جھومنا شاخوں پہ اک پرکیف عالم میں

کسی کا مسکراتے جاگنا پھر کھلکھلا دینا
کسی کا آہ بھرنا لوٹنا اک سوزِ پیہم میں

سرِ شام ایک عالم مائلِ سیر و تماشا ہو
جنوں بھی راہ لے سنجیدگی سے کوئے جاناں کی

کوئی شاداں ہو راحت سے کوئی روئے مقدر کو
نئے غنچے کھلائے آرزو صبحِ درخشاں کی

وہ موسم سخت گرما کا تمازت مہرِ تاباں کی
کوئی سُنسان ویرانہ جہاں قبریں شکستہ سی

وہ لُو کی تند لہریں اور یاد اک آفتِ جاں کی
خدایا تھی یہ دنیا اک بہشتِ از یاد رفتہ سی

دکن میں موسمِ سرما کی راتیں خوشگوار ایسی
کہ جن کے سامنے حُسنِ بہاراں تک بھی شرمائے

قمر کی شب کے ایوانوں میں اک خاموش موسیقی
کسی کی کوچہ گردی جیسے غم سے دل کو گرمائے

زمانہ کے فراز و پست سے وہ ٹھوکریں کھانی
کبھی گر کر سنبھلنا اور بڑھنا زورِ ہمت سے
غرض کیا کیا مزے تھے تلخیوں میں دورِ گردوں کی
مگر اب اُن کی صرف اک یادِ غم انگیز باقی ہے

بہار کی رات

سفید ابروں کی چلمنوں میں چھپا لیا ہے قمر نے چہرہ
نقابِ سیمیں کسی نے گویا فضائے عالم پہ ڈالدی ہے
جہاں میں چاروں طرف نظر آ رہا ہے اک نور کا دھندلکا
بہار کی ابتدا کے دن ہیں ہوا بھی اٹھلا کے چل رہی ہے
زمانہ مدہوش ہو گیا ہے بھری ہے خوشبو کی مئے ہوا میں
چھڑا ہے ایسا خموش نغمہ کہ ذرّہ ذرّہ کو وجد آئے
ہے روح کی التجائے مضطر کہ سارے عالم میں پھیل جائے

جو نور افروز بزمِ عشرت ہے کوئی جا کر اسے سنادے
کہ دیکھ باہر ذرا نکل کر عجیب ہے پُرکیف تیرا گلشن
سحاب سا بن پہ چھا رہا ہے چمک رہے ہیں فلک پہ تارے
ترے لئے آج یاسمن نے کئے ہیں فانوس اپنے روشن
زمیں پہ ہے جوشِ لالہ و گل، فلک پہ ہے موجِ نورِ ظاہر
فضا میں اک حُسن کا سمندر لطیف ہلکورے لے رہا ہے
تو جلد ڈال اُس میں اپنی کشتی کہ وقت کتنا گذر گیا ہے

اپنے رقیب سے

عشق کی آگ ترے دل کی بجھادی کس نے؟
کس لئے تو نے کیا ترکِ محبت کا خیال؟
تیری آشفتہ مزاجی وہ چھڑادی کس نے؟
کس طرح ہو گیا مایوس تماشائے جمال؟
تیری تبدیل سے ہے دل میں خلش سی پیدا
چل کے دو چار قدم بیٹھ رہا تھک کے کہیں
ہاں بتا عشق ترا بوالہوسی ہے کہ نہیں؟

کود پھر عشق کے میدان میں ہمت کر کے
تو مرے نالوں سے کچھ تو تپش اندوزی کر

پی لے تلخابۂ آلام کو جرائت کر کے
حاصلِ سوز بہت ہے جو جگر سوزی کر

یہ بتا کیا مرے دل میں تھی تمنائے وصال
تجھ سے بڑھنے کے لئے میرا قدم اٹھتا تھا

راہ کٹتی تھی مری ختم سفر ہوتا تھا

ترکِ شعر

بند کرتا ہوں دکاں اے قدرداں اب الوداع
تیری خاطر میں سمندر سے گہر لایا کیا

تیرا احساں مانتا ہوں اے مرے جوہر شناس
لیکن اِس جوہر فروشی سے مجھے کیا مل گیا

عالمِ امکاں میں ہیں لاکھوں بیابان و چمن
اک کٹھن وادی سے دنیا میں گذرنا ہے مجھے

کیا جوابِ آخرت دونگا کسی کے روبرو
ڈگمگا جائے قدم اس راستے میں گر مرا

دست و پا شل ہو گئے جاتی رہی پروازِ روح
بارِ دنیا سر پہ ہے سیرِ چمن کا ذکر کیا

عرشِ آزادی پہ تھی اب تک پر افشانی مری
خارزارِ پائے بندی میں بھی ہے جانا مجھے

آج تک میں خود رہا عالم پہ اک بارِ گراں
اب گناہِ زیست کا ہو جائے کفارا ادا

ہو رہا ہوں آشنائے لذتِ تلخابِ دہر
اب مزہ جاتا رہا شیرینیِٔ گفتار کا

اب میں اِک ہمدم نہیں شاعر نہیں رِندی نہیں
خود غرض دُنیا طلب، مزدور بننا ہے مجھے

زورؔ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ایم۔اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لنڈن)

[ڈاکٹر صاحب کا کلام آپ کی پچھلی شاعری کی یادگار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشقِ سخن رہتی تو آپکی شاعری زور پر ہوتی۔ تخیل کا نیچرل رنگ اور جوش، نئے اسلوبِ شعری کے ساتھ وابستگی ایک اُمید افزا خصوصیت تھی۔ جامعہ عثمانیہ اور دکن سے آپکی قلبی محبت شاید آپ کا شاعرانہ مشرب بن جاتی جسکے ساتھ آپکی سلاستِ بیان کا بھی لطف آجاتا۔ غزل میں آپ کا رنگ مومن اور غالب کے دور کے مشابہ ہے۔ "آسمان سے خطاب" میں آپنے ایک وسیع مضمون کو بڑی خوش اسلوبی سے قلمبند کیا ہے]

چاندنی

پھر ذکرِ رونقِ شبِ مہتاب آگیا — سامانِ وحشتِ دلِ بیتاب آگیا
نقشے شبِ وصال کے آنکھوں میں پھر گئے — گردوں پہ بادلوں میں مہ و مہر گھر گئے
میں اور یادِ نعمتِ دیدار الاماں — گرتی ہیں خرمنِ دلِ مضطر پہ بجلیاں

موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہِ یار بھی وہی

ہوگا یونہی فلک پہ سدا ماہ ضوفشاں — ملجائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں
میں ہوں وہی مگر وہ طبیعت وہ دل نہیں — وہ ولولے نہیں وہ امنگیں نہیں رہیں
وہ جوشِ دادخواہیٔ بیداد اب کہاں — وہ شکوہ ہائے خاطرِ ناشاد اب کہاں

اب وہ خیالِ مستیٔ مئے خواب ہوگئے
غرقِ الم نشاط کے اسباب ہوگئے

نشتر دل و جگر میں چبھوئے ہوئے سے ہیں
نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں

آتی ہیں یاد شوق کی سرمستیاں مجھے
تڑپاتی ہیں زمانہ کی نیرنگیاں مجھے

اب دل میں خواہشِ شبِ مہتاب ہی نہیں
تفریح و انبساط کے اسباب ہی نہیں

ہاں عمر بھر کریں گے تجھے یاد چاندنی
اس قیدِ غم سے ہوں گے نہ آزاد چاندنی

آسمان کی زبان سے

عرصۂ امکاں پہ ہوں دیر سے میں حکمراں
حکم سے میرے رواں
بادلوں کے کارواں
کشتیوں کے بادباں
باغ کی سب نالیاں
عرصۂ امکاں پہ ہوں دیر سے میں حکمراں

۲

قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں
مخزنِ اسرار ہوں
مطلعِ انوار ہوں
مرجعِ افکار ہوں
درپئے رفتار ہوں
قافلۂ زیست کا کارواں سالار ہوں

— ۳ —

سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں
شہروں کی زیبائیاں
قوموں کی رعنائیاں
حُسن کی پرچھائیاں
عشق کی رسوائیاں
سامنے میرے ہوئیں معرکہ آرائیاں

حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں
عرش کی تفسیر ہوں
خلد کی تصویر ہوں
حُسن کی تنویر ہوں
خواب کی تعبیر ہوں
حامیٔ تدبیر ہوں مالکِ تقدیر ہوں

با این ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں
میں نہ تو محدود ہوں
اور نہ مفقود ہوں
نام کو موجود ہوں
شعلۂ بے دود ہوں
با این ہمہ برتری خاک میں آلودہ ہوں

افسانۂ محبت

بھردے مئے الفت سے ساقی مرا پیمانہ — آباد رہے دائم یہ عشق کا مے خانہ
ہنستوں کو جو رُلوادے مستوں کو جو تڑپادے — مُردوں کو جو گرمادے وہ ہے مرا افسانہ

ہیں یاد ابھی وہ دن تھی تیری جبیں سادہ — عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بیگانہ
تھا دخل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی — انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نہ یارانہ

وہ راحتِ جاں بننا وہ روٹھ کے من جانا — وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرہ پہ چمک جانا — وہ وقتِ خرام اُن کے اعضا کا لچک جانا

مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی باتیں — محجوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ
مجنوں کو ہو حیرانی وامق کو پریشانی — فرہاد کو ہو سکتا خسرو بھی ہو دیوانہ
آباد ہے الفت سے داتا کی عنایت سے — دنیا مری نظروں کی دل کا مرے کاشانہ

رہبرِ منزل کی جدائی

آج گلشن کے اُجڑنے کی خبر آئی ہے — دلِ ناشاد پہ کلفت کی گھٹا چھائی ہے
نہ وہ ساقی ہے نہ وہ انجمن آرائی ہے — چار سو مجمع اغیار ہے رسوائی ہے

رقص کرتے نظر آئیں گے نہ ارماں دل میں
کوئی بیتاب رہے گا کوئی حیراں دل میں

عندلیبانِ چمن کا نہیں پرساں کوئی — نظر آتا نہیں اب شعلۂ عریاں کوئی
پھول ہیں باغ میں لیکن نہیں خنداں کوئی — اس گلستاں کو کہے گا نہ گلستاں کوئی
نظر آتا نہیں سامانِ مسرت باقی
اب وہ اگلی سی نہ راحت ہے نہ فرحت باقی

شعلے اٹھنے ہی کو تھے وادیٔ سینا سے ابھی — مست آنکھیں نہ ہوئیں کیفِ تماشا سے ابھی
لہریں اٹھتی ہیں مری چشمِ تمنا سے ابھی — جان آئی نہ تھی انفاسِ مسیحا سے ابھی
سیکھتے تھے ابھی پرواز پرِ پروانہ
تشنہ لب تھے ابھی رندانِ درِ میخانہ

کوئی بے وقت یہ محفل کا اجڑنا دیکھے — راہ میں رہبرِ منزل کا اجڑنا دیکھے
شاہدِ حسن کی محفل کا اجڑنا دیکھے — کس طرح اپنے کوئی دل کا اجڑنا دیکھے
یاد تڑپائے گی زور اس کی ہمیشہ ہم کو
نہ ملا ہے نہ ملے گا کوئی ایسا ہم کو

جامعہ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن

مژدہ باد اے ہم صفیرو پھر بہار آنے کو ہے — شاہدِ ملکِ دکن پر پھر نکھار آنے کو ہے
پھر صبا آنے کو ہے بے اختیار آنے کو ہے — جوش پر پھر رحمتِ پروردگار آنے کو ہے
ظلمتِ جہلِ زبوں کافور ہوتی جائے گی
کلفتِ ادبار و نکبت دور ہوتی جائے گی

آج کل غنچوں کی وہ دل تنگیاں باقی نہیں
کشت زاروں میں تردد کے نشاں باقی نہیں

پیچ سنبل میں میانِ بوستاں باقی نہیں
طائروں کے دل میں بھی خوفِ خزاں باقی نہیں

پھول پھل سب نشۂ آبِ طرب میں چور ہیں
مست ہیں خوش ہیں جوانانِ چمن مسرور ہیں

زینتِ فصلِ بہاراں نونہالانِ چمن
ہیں خوشی میں نغمہ زن سب مثلِ مرغانِ چمن

اُف رے گلشن کی فضا اللہ رے شانِ چمن
کیا سرور افزا نظر آتے ہیں سامانِ چمن

جامعۂ عثمانیہ اب جلوہ گاہِ طور ہے
ہر طرف پرتو فگن علم و عمل کا نور ہے

اس کے ہر ذرہ کو رشکِ آفتاب اب دیکھئے
عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھئے

ہو چکا منت کشی کا سدِ باب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے یہ انقلاب اب دیکھئے

داغہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ دکن شاداب ہوتے جائیں گے

غزلیں

۱

شب غم کی نہ ہوگی انتہا کیا
نہ لائے گا خوشی کا دن خدا کیا

مری آنکھوں میں جلوہ اپنا دیکھو
یہ ہر دم دیکھتے ہو آئینہ کیا

خضر کیا جانیں تم پر جان دینا
انھیں اس مرحلہ سے واسطہ کیا

کروں کس مُنہ سے غیروں کی شکایت
سناؤں اپنے غم کا ماجرا کیا

ترے در پر جو آیا پھر نہ اٹھا
یہی دنیا میں تھا اک آسرا کیا؟

بتوں سے مہربانی کی توقع
مرے ذوقِ طلب کا پوچھنا کیا

وہ بزمِ غیر وہ جھوٹے فسانے
انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا

نہیں معلوم نکلیں گے یہ کیوں کر
دلِ غمگیں میں ہیں ارمان کیا کیا

بڑھے جوشِ محبت میں جب آگے
بلند و پست کیا ارض و سما کیا

گنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے
یہ آخر زورؔ تم کو ہو گیا کیا؟

۲

بن کے انگشتِ اشارت جو اشارا کر دے
نگہ ناز تری کیا کہوں کیا کیا کر دے

بھر دے آہوں میں خیالِ رخِ تاباں آتش
اور اشکوں کو مرے روکشِ دریا کر دے

دلِ پُریاس ہے صد تشنۂ سوزِ پنہاں
اس کو مرہونِ شررہائے تمنا کر دے

ضبط آخر یہ ترا دیدہ گریاں کب تک
کیفیت ابرِ بہاراں کی ہویدا کر دے

دل ہُو سہائے مجازی میں یہ خستہ خستہ
خوف ہے رازِ حقیقت کہیں افشا کر دے

عاشقوں میں ہے مواخات کا رشتہ قائم
شمع پر زورؔ نہ کیوں خون کا دعویٰ کر دے

۳

دل جب سے ہوا ہے خوگرِ غم آزار میں لذت پاتا ہوں
گلبانگِ مسرت دور رہے میں اس سے بہت گھبراتا ہوں

ہر روز ہزاروں زخم نئے اس زخمی دل پر کھاتا ہوں
افتاد سے ہوں مجبور رہو اکب چاہ سے میں باز آتا ہوں

وہ ناز و ادائیں سرگرمی سو رنگ سے جب دکھلاتے ہیں
جذبات کو لے کر پہلو میں سرگرم وفا ہو جاتا ہوں

اے زور نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہی یہ سب دھوکے کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

زیبا۔ سیّد علی حسنین ایم۔اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر

[حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ ان کے وارداتِ قلبی کبھی ایک افسانہ کبھی ایک رات، کے عنوان سے اپنا روپ دکھاتے ہیں۔ ان کی کہنہ مشقی عثمانیہ شاعری کے قالب میں جلوہ گر ہو کر ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ نیچرل تشبیہات سے شعر کو چراغ اور ستاروں کی روشنی دیتے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں پر ان کی طبیعت مائل ہے۔ غزل میں وہ دورِ جدید کے غزل گو اساتذہ کے پیرو نظر آتے ہیں۔ "زندگی" والی نظم میں ارتقائے حیات کو شاعر کی نگاہ سے بڑی خوبی کے ساتھ دیکھا ہے۔]

جذبۂ شعر سے خطاب

رضائے دوست کو وہ مرتبہ دیا تو نے
خیالِ دوزخ و جنّت بھلا دیا تو نے

بنا کے دل کو مرے اصلِ مذہب و ملّت
رواج و رسم کی زد سے بچا دیا تو نے

تمام عشق کی تاریخ سونپ کر مجھ کو
روایتوں کا خزانہ لٹا دیا تو نے

جمالِ طور فسانہ نہیں حقیقت ہے
مجھی پہ برق گرا کر بتا دیا تو نے

دلہن کی طرح سجا کر گناہِ الفت کو
حجابِ شرم کا پردہ گرا دیا تو نے

کسی کی یاد میں رہنا جو اک عبادت تھا
کسی کی یاد کو واجب بنا دیا تو نے

نیازِ عشق میں رکھ کر غرور کا پہلو
امینِ رازِ محبت بنا دیا تو نے

فریبِ عجز کی کیا کیا حقیقتیں کھولیں
خودی کا مجھ کو پیمبر بنا دیا تو نے

کسی حقیقتِ پنہاں کو بے نقاب کیا — تصورات میں جب مسکرا دیا تو نے
زہے نوازشِ پیہم کہ دل کی دھڑکن میں — امینِ وحی کا نغمہ سنا دیا تو نے
وہ نغمہ جس پہ فرشتے بھی وجد کرتے ہیں — فضائے نور پہ سکّہ جما دیا تو نے
اسی کا ساز ہے بنیادِ جنبشِ موزوں — نجوم و شمس کو رقصاں بنا دیا تو نے
ترے جمال کو میں نے ہمیشگی بخشی
مرے خیال کو رنگیں بنا دیا تو نے

زندگی

نغمۂ غم اک ازل کے دن سے تھا — بانسری میں عشق کی سویا ہوا
اک تبسّم پر کسی کے چونک اٹھا
زندگی شاید اسی کا نام ہے

روح اک ذرّوں میں محوِ خواب تھی — نور کے اوراق میں لپٹی ہوئی
تھرتھرا کر اس نے اک انگڑائی لی
زندگی شاید اسی کا نام ہے

اس قدر ظاہر کہ نظروں سے نہاں — اتنی پوشیدہ کہ ہر شے سے عیاں
راز ہونے پر بھی ہو جو داستاں
زندگی شاید اسی کا نام ہے

رقص میں ہے ایک فانوسِ بلور — چھن رہا ہے جس کے ہر پہلو سے نور
مختلف رنگوں میں ہے حسن کا ظہور
زندگی شاید اسی کا نام ہے

شاہ کے چینِ جبیں میں مستتر
فلسفی کے تیوروں میں جلوہ گر
عارفِ کامل کے سینے میں شرر
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک حسرت اک دلِ خاموش میں
ایک لرزش پیکرِ مے نوش میں
ایک تجلی طور کے آغوش میں
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک مفلسِ بے نوا کے لب پہ آہ
ایک منعم کا غرورِ عزّ و جاہ
اک بتِ کافر کی دزدیدہ نگاہ
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ایک شعلہ آتشِ رخسار کا
ایک پھندا گیسوئے خمدار کا
ایک سجدہ آستانِ یار کا
زندگی شاید اسی کا نام ہے

قطرۂ شبنم پہ لرزاں آفتاب
بہتے پانی میں مچلتا ماہتاب
سرمدی دریا میں اک سرکش حباب
زندگی شاید اسی کا نام ہے

غم فزا نغموں کا مخزن اک رباب
جاگنے والوں کا اک دلچسپ خواب
لیلیٰ فطرت کا وہ رنگیں شباب
زندگی شاید اسی کا نام ہے

روحِ شاعر جس سے شعلہ پیرہن
ہے جو مطرب کی زباں سے نغمہ زن

یا مصوّر کے قلم کا بانکپن
زندگی شاید اسی کا نام ہے

ہر نفس میرا ہے آہِ سرد سا
روز و شب رہتا ہے چہرہ زرد سا

دل میں ہے زیبا مرے اک درد سا
زندگی شاید اسی کا نام ہے

سکون

رات تاریک، سراپا ہے سراسر خاموش
بےخبر گوش و نظر، نور و صدا ہیں بےہوش

نور جس طرح کہ یاد آئے کسی کو بچپن
اور صدا، جیسے مسکتا ہوا گل کا دامن

موج امید کی جیسے کہ دلِ انساں میں
بلبلہ جیسے کوئی ٹوٹ گیا پانی میں

دھیان عزّت کا کبھی عالمِ رسوائی میں
دل کی سرگوشیاں جیسے کبھی تنہائی میں

اک تبسّم کا تصوّر کبھی روتے روتے
آنکھ کھل جائے کبھی جیسے کہ سوتے سوتے

لہر الہام کی جیسے دلِ پیغمبر میں
حرکت اشک کی جس طرح کہ چشمِ تر میں

دل کی تصویر سی ہے دل مرا اس عالم میں
نہ مسرّت کے اثر میں نہ فضائے غم میں

یاد ہے دل میں کسی کی نہ تمنّا کوئی
رُوح جیسے کہ پڑی پھرتی ہے کھوئی کھوئی

یہ سکوں۔ اف یہ سکوں تو مری فطرت میں نہیں
پیش خیمہ کسی طوفان کا یہ ہو نہ کہیں!

نغمۂ سحر

سحر کی تاریک روشنی میں ستارہ اک جھلملا رہا ہے
مری مژہ پر ہے جو ستارہ وہ آنکھ اس سے ملا رہا ہے

افق پہ بجلی ٹھہر گئی ہے، لکیر سی نور کی کھنچی ہے
نظر مری مجھ سے کہہ رہی ہے کہ یہ کوئی مسکرا رہا ہے

وہ منظر کوئے دوست اے دل وہ تیری حیرت فروش جنت
یہ کیا ستم ہے کہ یہ سماں بھی جھلک اسی کی دکھا رہا ہے

خدا ہی اس راز سے ہے واقف کسی کا دل ہے کہ اشکِ شبنم
پڑا ہے سبزہ پہ ایک موتی جو دیر سے جگمگا رہا ہے

کسی شہیدِ رہِ محبت کی غالباً روحِ مضطرب ہے
وہ سامنے شاخ پر پپیہا جو درد اپنا سنا رہا ہے

فضا میں کچھ رنگ ابھر رہے ہیں، فلک پہ جلوے بکھر رہے ہیں
الٰہی یہ کون رفتہ رفتہ نقاب رُخ سے اٹھا رہا ہے

سحر کے جوہر سمٹ رہے ہیں، نظر سے پردے الٹ رہے ہیں
شعاع بنکر کوئی فرشتہ پیام فطرت کا لا رہا ہے

شبِ جدائی کا منہ بھرا یا، سحر کا قاصد پیام لایا
پیام لایا کہ رونے والے وصال کا دن بھی آ رہا ہے

اگرچہ دل اور فسردہ دل کی مآل پر بھول کی نظر ہے
مگر اسی دل کو بھول اس دم شگفتہ ہونا سکھا رہا ہے

پریم نگری سے آ رہی ہے یہ کیسی ٹھنڈی ہوا کہ زیبا
جو دل ابھی تک نڈھال تھا وہ خوشی کی بنسی بجا رہا ہے

بَرسَات کی ایک رَات

ہائے کیا شب تھی فضائے دَہر پر چھائی ہوئی
جس کی تاریکی تھی پُورے جوش پر آئی ہوئی

پرسکوں گہرائیوں میں دل کی طوفاں خیز رات
وہ بھری برسات کی جذبات سے لبریز رات

رات جو پہلی محبت کی طرح خونخوار تھی
فطرتِ بیدرد کی ڈھالی ہوئی تلوار تھی

گہرے گہرے رنگ کے بادل، ہواؤں میں بھرے
پھر رہے تھے ہر طرف اک درد بکھراتے ہوئے

ننھی ننھی بوندیاں گرتی تھیں فرشِ خاک پر
یا تمنائیں برستی تھیں دلِ نمناک پر

تر بتر جھونکے ہواؤں کے، امنگوں میں بسے
ایک پیغامِ عمل تھے سرد آہوں کے لئے

منظرِ تاریک میں وہ دفعتاً اک روشنی
چونک اٹھتی تھیں امیدیں دل کی سب سوئی ہوئی

سرنگوں تھا خوابِ راحت لذتِ غم دیکھ کر
دل بدل جاتے تھے سینوں میں یہ عالم دیکھ کر

کروٹوں پر کروٹیں تھیں، نیند پر آتی نہ تھی
خواب کی نازک پری تکلیف فرماتی نہ تھی

دل نے اِک کروٹ اِدھر بدلی زمانے کی طرح
یاد آیا تو اُدھر بھولے فسانے کی طرح

دل کی وہ سنسان گلیاں چونک اٹھیں اس یاد سے
شورشوں کا سلسلہ پیدا ہوا فریاد سے

صبر کی مضبوط بنیادیں یکایک ہل گئیں
سرد آہوں کو گذر جانے کی راہیں مل گئیں

لاکھ روکا درد لیکن دِل کو تڑپا ہی گیا
لب پہ تیرا نام، آنسو آنکھ میں آ ہی گیا

پپیہا اور عورت

آتشِ الفت کا چھوٹا سا شرر
دردِ دل کی کائناتِ مختصر

آب و گل کا پیکرِ آشفتہ حال
اہلِ دنیا کو پیامِ بدشگال

اک پپیہا ہستیٔ نوحہ طراز
رنگ و بو کی بزم کا ہنگامہ ساز

جس کا ہے دن رات نالہ پی کہاں
جانے رہ جاتا ہے اس کا جی کہاں

کر رہا ہے دعوتِ گوش و نظر
آم کی جھکتی ہوئی اک شاخ پر

بادل اودے اودے ہیں چھائے ہوئے
جی اٹھے ہیں پیڑ مرجھائے ہوئے

ہے محرک خون میں ہیجان کا
کھیت لہریں لے رہا ہے دھان کا

جیسے فطرت دے رہی ہے لوریاں
گر رہی ہیں نیم سے نمکوریاں

اک حسینہ ملکۂ حسن و شباب
جیسے پھولوں میں تر و تازہ گلاب

اپنا نازک ہاتھ رکھے شاخ پر
سرنگوں ہے دیر سے زیرِ شجر

کھوئی کھوئی ہجر کو روداد میں — اپنے پردیسی پیا کی یاد میں
شرم صدقے عشوۂ بیباک پر — کچھ دوپٹہ جسم پر کچھ خاک پر
آم کے مانند چہرہ زرد ہے — رنگ کہتا ہے کہ دل میں درد ہے
اللہ اللہ حسنِ غمگیں کا اثر — رہ گئی ہے کائنات اک حال پر
محوِ غم کس درجہ یہ مہجور ہے — جیسے اِس منظر سے کوسوں دور ہے
اس کا منظر اس کی دنیا انتظار — رس بھری آنکھوں سے پیدا انتظار
پر پپیہے کی سی آزادی نہیں — نقش فریادی ہے فریادی نہیں
اس کی فریادوں میں کتنا جوش ہے — اس کا نامہ کس قدر خاموش ہے

نسل انساں کے لئے غربت ہے یہ
ضبط کی پتلی ہے اِک عورت ہے یہ

تیری یاد

یہ دل ابھی ابھی یوں مجھکو ستا رہا تھا — ہمدرد بن کے ظالم درد آزما رہا تھا
شفاف آئینہ اِک ایسا دکھا رہا تھا
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

پیشِ نظر تھے یکسر گذرے ہوئے نظارے — جنت کے پھول تھے کچھ دوزخ کے کچھ شرارے
کچھ موت کے بہانے کچھ زیست کے سہارے
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

سب یاد آرہے تھے، بھولے ہوئے فسانے کچھ خواب تھے پرانے کچھ خواب تھے سہانے
کچھ دل کی دھڑکنوں پر گائے ہوئے ترانے
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

اک جنتی جہنم تھا آہ وہ زمانہ پہلے پہل وہ دل کی آواز لب تک آنا
اور اپنا رازِ الفت، اپنے ہی سے چھپانا
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

دو سال تک وہ میرا فرقت کے رنج سہنا قصے اِدھر اُدھر کے پیہم وہ دل سے کہنا
وہ بھولنے کی کوشش، وہ دُور دُور رہنا
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

تھا زندگی کا دوزخ، وہ ہجر اختیاری ہر کوششِ سکوں سے بڑھتی تھی بیقراری
وہ سعیِ ضبط پیہم، پیہم وہ اشک باری
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

اس کشمکش میں عالم ایسا ہی آچکا تھا احساس کا خزانہ بالکل مٹا چکا تھا
دنیا کی ہر لطافت، دل سے بھلا چکا تھا
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

کچھ جانتا ہے کیسا بے ربط خواب تھا وہ رنگین داستاں لیں بے رنگ باب تھا وہ
جاڑوں کی چاندنی تھی مفلس شباب تھا وہ
تو یاد آرہا تھا، تو یاد آرہا تھا

کیا بھولنے کی شئے ہے' وہ تیرے پاس آنا
مدّت کے بعد لیکر کچھ دل میں آس آنا
وہ بیخودی کا عالم' وہ بے حواس آنا
تو یاد آرہا تھا' تو یاد آرہا تھا

دل میں طرح طرح کے وسواس آرہے تھے
جذبات آنے والے نقشے دکھا رہے تھے
آنکھیں تھیں اشک افشاں' لب مسکرا رہے تھے
تو یاد آرہا تھا' تو یاد آرہا تھا

وہ واپسی کا عالم خود ایک زندگی تھی
داماں و آستیں میں نکہت بسی ہوئی تھی
فردوس کوچہ کوچہ' جنت گلی گلی تھی
تو یاد آرہا تھا' تو یاد آرہا تھا

اک حسنِ مشتعل تھیں رنگینیاں نظر کی
ہر لمحہ بن گیا تھا' تسکین عمر بھر کی
چمپائی ہر سحر تھی' ہر شام نیلوفر تھی
تو یاد آرہا تھا' تو یاد آرہا تھا

جلوے کی تابشوں میں دھوئی ہوئی تھی دنیا
اک نیند تھی کہ جس میں کھوئی ہوئی تھی دنیا
اک خواب تھا کہ جس میں کھوئی ہوئی تھی دنیا
تو یاد آرہا تھا' تو یاد آرہا تھا

اے دوست

اندوہ و الم گھیرتے ہیں جب دلکو
اور اپنی طرف پھیرتے ہیں جب دلکو
امید کا خوشنما اور رنگیں چہرہ
بھولے سے دکھاتا نہیں جلوہ اپنا

ناکامیاں مضحکہ اڑاتی ہیں جب — محرومیاں قسمت کی رلاتی ہیں جب
چھوٹی ہوئی منزلوں کا غم ہوتا ہے — گزری ہوئی عمر کا الم ہوتا ہے
ہوتا ہے یہ آشکار چہرے سے مرے — جیسے دل کے ہوئے ہیں ٹکڑے ٹکڑے
اس دم اے دوست یاد آتا ہے تو — میرے اشکوں میں مسکراتا ہے تو
ہر رنج و الم کو بھول جاتا ہوں میں — دل کو مسرور و شاد پاتا ہوں میں

اور یاد میں تیری محو ہو جاتا ہوں
گویا کہ مسرتوں میں کھو جاتا ہوں

معصوم نغمہ

میرا فردوسِ محبت ہے سراسر نغمہ زار — اور ان نغموں کا ہے ربط سانسوں پر مدار
اسکی وسعت میں ہیں پنہاں حسن کے پاکیزہ راز — کتنی دوشیزہ ادائیں، کس قدر معصوم ناز
یاد اک پرکیف نغمہ کی دلاتا ہوں تجھے — سرزمینِ بیخودی میں لے کے جاتا ہوں تجھے
خواب کا منظر، دھندلکا سا، فضا میں نیند سی — کچھ شراب آمیز ہر موجِ ہوا میں نیند سی
سامنے اک سرو قد تعبیرِ حسنِ ماسوا — اس قدر اونچا کہ میرے دل سے کچھ یونہی بڑا
حسنِ صورت، بھول ایسے چاند کی جلوہ گری — سرزمینِ دل میں جو چٹکے، کچھ ایسی چاندنی
جامِ مئے بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، بڑھتا گیا — لو مبارک خطِ پیمانہ لبوں تک آگیا
کوثر و تسنیم کی ہلکی سی دو موجیں اٹھیں — تھرتھراتی کانپتی لجاتی تھیں جو موجیں اٹھیں
اس کی لرزش سے ہویدا حکمِ مرگِ ناگہاں — اس کی جنبش سے نمایاں، زندگی جاوداں
اشک جو آنکھوں میں کملائے وہ فرحت ایک میں — زہر جو ہونٹوں پہ بن جائے وہ لذت ایک میں

شہد بھی ہے زہر بھی، امرت بھی ہے اور مے بھی ہے
ذائقہ جس کا ہے نامعلوم ایسی شئے بھی ہے

یاد ہے وہ عالمِ نو، ماورائے مرگ و زیست
چھوڑ آئے تھے بہت پیچھے بنائے مرگ و زیست

سیکڑوں جلووں میں لرزاں تھی ہماری زندگی
بجلیاں، قوس قزح، تاریکیاں، تابندگی

کچھ خماریں کیفیت، کچھ مستیاں، کچھ بیخودی
تیز نبضیں اشک آنکھوں میں، دلوں میں آگ سی

دفعتاً سازِ تنفس سرمدی لَے میں چھڑا
اور فضائے عشق کا معصوم نغمہ گونج اٹھا

غزلیں

نہ ہنسانا مجھے چاہا نہ رُلانا چاہا
غم نے اک پیکرِ تصویر بنانا چاہا

حُسن بنکر ہی رہی چاکِ گریباں کی ادا
جوشِ وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا

لطف تو یہ ہے کہ تدبیر سے عاجز تھے ہیں
موت نے بھی کوئی آنے کا بہانا چاہا

مجھ پہ اک اور شبِ غم یہ قیامت ٹوٹی
مسکراتے ہوئے تاروں نے ہنسانا چاہا

دلِ مرحوم سا دیکھا نہیں پابندِ وفا
جان پر کھیل کے ایمان بچانا چاہا

ڈوبتے کیلئے تنکے کا سہارا تھا بہت
تم نے خود میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا

برمحل ان کی نگاہوں میں تبسم دیکھا
ہم نے جب درد کا احساس چھپانا چاہا

کون اِس عالمِ تخئیل میں رہبر تھا مرا
راہ بھولا تو مجھے کس نے بتانا چاہا

بیٹھے بٹھلائے لیا مفت کا جھگڑا زیبا
دلِ دیوانہ کو کیوں راہ پہ لانا چاہا

۲

مجھے نوازشِ جلوہ بھی سازگار نہیں
کہ آپ اپنی نگاہوں پہ اعتبار نہیں

ملے ہیں سب کی نشانی ہیں داغِ ناکامی
وہ کون سی ہے تمنّا جو یادگار نہیں

ہوا نے دوش پہ رکھی ہی خاکِ پروانہ
شہیدِ عشق کا لاشہ زمیں پہ بار نہیں

خود اپنے ہوش میں آنے کا منتظر ہوں میں
مجھے اب آپ کے آنے کا انتظار نہیں

عدم سے واں مجھے لائی ہوائے آزادی
جہاں کہ اپنی طبیعت پہ اختیار نہیں

وفا کا عہد وہ کرتے ہیں مجھ سے چپ ہوں میں
نگاہِ یاس نہ کہہ دے کہ اعتبار نہیں

جمالِ یار بھی ہے دیدنی مگر زیبا
نگاہِ عشق میں کچھ بھی سوائے یار نہیں

۳

بہت مزاجِ محبّت سے آشنا ہوں میں
ہنسی بھی آئی ہے لب تک تو رو دیا ہوں میں

مجاز ہوں پہ حقیقت کا مدّعا ہوں میں
اسی کی بات بنانے کو بولتا ہوں میں

مری امید کے گیسو سنوارنے والے
ترے خیال کی دُنیا سنوارتا ہوں میں

ستارے گوش بر آواز، کائنات خموش
کہ جیسے اُن سے کوئی راز کہہ رہا ہوں میں

شعاعِ صبح میں او مدعی تبسّم کے
تجھے تو پچھلے پہر سے پکارتا ہوں میں

تجلیوں میں نہاں ہیں تسلّیاں بھی کہیں
گلوں میں، ذرّوں میں، تاروں میں ڈھونڈھتا ہوں میں

صبا صبا تری نکہت فروشیاں مشہور
یہ کیا یہ کیا ہے کہ بے کیف ہو رہا ہوں میں

کھنچے گا مجھ سے کہاں تک وہ دامنِ رحمت
گناہ کر کے بھی کچھ روز دیکھتا ہوں میں

بشر ہوں میں مجھے دعوائے ہوش کیا زیبا
کہ ہوش وادیِ ایمن میں کھو چکا ہوں میں

۴

وفا یا فریبِ وفا چاہتا ہوں
کوئی زیست کا آسرا چاہتا ہوں

جو ہمت ہو مجھکو سنبھالیں دو عالم
کسی کی نظر سے گرا چاہتا ہوں

توجہ پہ لرزاں تغافل سے نالاں
خدا جانے میں اُن سے کیا چاہتا ہوں

سنبھلنے نہ دیگی یہ قیدِ عناصر
سہارا ترے درد کا چاہتا ہوں

خموشی مری ضبط کی ادعا ہے
نظر کہتی ہے، بولنا چاہتا ہوں

فقط ایک جلوہ، فقط اک تبسم
گناہِ وفا کی سزا چاہتا ہوں

زہے حُسنِ مقصد کہ ہر دل میں زیباؔ
محبّت کی نشو و نما چاہتا ہوں

۵

کسی کے دِل میں ارماں بھی ہیں بجلی گرانے کے
مگر شائستہ جلوہ نہیں تیور زمانے کے

بظاہر ایک مرجھائی کلی پر ہے نظر اپنی
مگر پیشِ نظر ہیں حادثے کیا کیا زمانے کے

وہی نغمے جنہوں نے مجھکو کافر آج ٹھیرایا
وہی اک دن اصولِ زندگی ہونگے زمانے کے

سحر ہوتے کسی کی بانسری سُنکر تڑپ اٹھا
یہ قلبِ ناتواں اور اس پہ دعوے غم اٹھانے کے

بُجھا اے صبحِ روشن قلبِ پروانہ کے شعلے بھی
ارادے ہیں فقط کیا شمع کے تیور بجھانے کے

اسیروں کو سنہری بیڑیوں کی قدر کیا ہوگی
قفس کو کب سراہینگے یہ بندے آشیانے کے

وفا و صبر نے رودادِ الفت کیا سے کیا کردی
ہزاروں مرثیے لکھے گئے اپنے فسانے کے

دھڑکنا سننے والے دو دلوں کا ایک دن سمجھیں
ارادے عشق کے ہیں اس طرح دو دل ملانے کے

مقدر راس لائے عشق کی آسودگی زیباؔ
ہمیں بھی زیرِ خنجر حوصلے ہیں مسکرانے کے

سازؔ۔ صمد رضوی ۔ بی۔ اے، ال ال بی (عثمانیہ)

[ان کی نظموں میں سازِ حسن و عشق ہمیشہ بجتا رہتا ہے۔ نشۂ الفت میں مدہوش ہو کر ہمیشہ اپنے دوست، کو پکارتے ہیں۔ کبھی کبھی قدرت کا حسن بھی انھیں تڑپا دیتا ہے جو ان کے "حبیب" ہی کی خوبصورتی کا پرتو ہے۔ زبان میں لطافت، ترکیبوں میں شیرینی اور ترنم لئے ہوئے اپنا نغمہ سناتے ہیں۔ انکا دل دنیا کی کثافتوں سے دور عشق کی پاک سرزمین میں رہتا بستا نظر آتا ہے، یہی اثر ہے کہ ان کے نغمے آبشار کی طرح بہتے ہیں اور ہر زمین میں نئے انداز سے اپنے بہاؤ کا ایک ہی راستہ نکال لیتے ہیں "مغنیہ" اور آرزوئے رنگین میں ان کی نغمہ سرائی پورا رنگ دکھا رہی ہے۔]

تلاشِ سکون

مرا سکون یہ دنیائے ہائے و ہو میں نہیں
جہانِ حسن کی امواجِ رنگ و بو میں نہیں
نہ جلوۂ سحری میں نہ آفتاب میں ہے
نہ شام میں، نہ شفق میں، نہ ماہتاب میں ہے
نہ سوز و ساز میں نے ربط و رباب میں ہے
جہانِ شعر میں، نے کرب و اضطراب میں ہے

نہیں مناظرِ فطرت کی دل نوازی میں
نہیں جہانِ حوادث کی کارسازی میں

ہزار بار لبِ جُو کی سیر کی میں نے
بہار سبزہ و گل میں شراب پی میں نے
طلب کیا کبھی کہسار کی گھٹاؤں سے
کیا سوال کبھی صبح کی ہواؤں سے
عزیز دوست، خودی میں بھی آ کے دیکھ لیا
کبھی تجھے کبھی خود کو بلا کے دیکھ لیا

چمن چمن میں بہار و خزاں سے پوچھ لیا — کلی کلی سے، گل و گلستاں سے پوچھ لیا
زمیں سے مانگ لیا، آسماں سے پوچھ لیا — غرض کہ ساز نے دونوں جہاں سے پوچھ لیا

مگر سکون اِسے کائنات دے نہ سکی!
تمام شورشِ بزمِ حیات دے نہ سکی!

مری تلاش پہ اے دوست مسکرائے جا — مرے جنونِ محبت کو آزمائے جا
سمجھ گیا ہوں مری جستجو کا حاصل ہے — مری حیات تری آرزو کا حاصل ہے

تری خوشی میں نہاں ہیں مسرتیں میری
سمٹ گئیں تری ہستی میں راحتیں میری

واردات

مرے حبیب یہ تاکیدِ ضبطِ غم کیسی — تجھے یہ فکر فراموشیٔ کرم کیسی
خیالِ ترکِ وفا ہی سے کانپ جاتا ہوں — سنبھال اے غمِ الفت کہ لڑکھڑاتا ہوں
بس ایک دُھن ہے اسی دُھن میں گائے جاتا ہوں — ترا سکوتِ وفا آزمائے جاتا ہوں
یہ جانتا نہیں کس سمت جا رہا ہوں میں — ہے اتنا ہوش کہ تجھکو بلا رہا ہوں میں
خدائے عشق کو اپنا بنا رہا ہوں میں — تو مجھ سے دور ہے نزدیک آ رہا ہوں میں
رواں دواں ہوں کہیں اب مجھے قیام نہیں — یہ بیخودی مری پابندِ صبح و شام نہیں

جو اُس کے سجدوں کو ملجائے پائے ناز ترا
خوشی سے جان ہی دے دے غریب ساز ترا

"مغنیہ"

ابھی اے حسین مغنیہ یونہی گائے جا یونہی گائے جا

ہے سکوں طلب غم زندگی غم زندگی کو مٹائے جا
جو نظر پہ کاوش و خرد کے پردے پڑے ہوئے ہیں اٹھائے جا
تو فضا کی وسعت بیکراں پہ شراب نغمہ بہائے جا
یہ نشاط و حسن کی داستاں جو سنا رہی ہے سنائے جا

ابھی اے حسین مغنیہ یونہی گائے جا یونہی گائے جا

ترے نغمہ ہائے سرود میں کبھی لذتیں ہیں شراب کی
کبھی غم نوازیٔ عشق ہے کبھی کیفیات ہیں خواب کی
کبھی سحر کاریٔ حسن ہے کبھی لغزشیں ہیں شباب کی
کبھی رنج کوش مسرتیں ہیں امر جہان خراب کی

ابھی اے حسین مغنیہ یونہی گائے جا یونہی گائے جا

مری روح تشنۂ ساز ہے ابھی اسکی پیاس بجھی نہیں
جو تصورات نہ پا سکیں وہ نشاط زیست ملی نہیں
جو ہے بصورت اشک مجھکو نصیب ایسی خوشی نہیں
مرے دل کی سرد کثافتوں میں لطیف خندہ زنی نہیں

ابھی اے حسین مغنیہ یونہی گائے جا یونہی گائے جا

ابھی مجھکو اپنی خبر ہے یں یہ طلسم ہوش مٹا تو دوں
جو کسک ہے درد کی دلمیں اسکو نوائے نغمہ سکھا تو دوں
جو مشاہداتِ نظر ہیں خواب و خیال ان کو بنا تو دوں
میں خودی کو اور خودی کی ساری حقیقتوں کو بھلا تو دوں

ابھی اے حسین مغنیہ یونہی گائے جا یونہی گائے جا

آرزوئے رنگین

جب رات کی گہری تاریکی خاموش خلا پر چھا جائے
جب نھنے نھنے تاروں کی آنکھوں میں نیند سما جائے
جب گردشِ پیہم سے تھک کر جنگل کی ہوائیں سو جائیں
جب فکرِ حال و مستقبل مٹ جائے دماغِ ہستی سے
جب ہستی کی ہر موجِ نفس مخمورِ شرابِ راحت ہو
جب ٹوٹ کے سیارہ کوئی تاریکیوں میں گم ہو جائے

جب خاک کے ذرے ذرے پر اک کالا ناگ سا لہرائے
اک ہوش طلب بیہوشی سی پتے پتے پر چھا جائے
پھولوں کی پریشاں نکہت سے بد مست فضائیں ہو جائیں
صہبائے فراموشی چھلکے دنیا پہ ایاغِ ہستی سے
پابوس حسنِ محبت ہو اور حسن نثارِ الفت ہوئے
جب نبضِ حیاتِ خفتہ میں اک لرزش ہو کر کھو جائے

جب لیلائے شب کی زلفیں آجائیں کمر تک بل کھا کر
کہسار کی چوٹی سے جھانکے وہ لالہ گوں بد مست قمر

یوں جیسے کوئی دوشیزہ مخمور نگاہوں سے تاکے
جب بہکی بہکی کرنوں کا احساس خمارِ صہبائی
جب چاند کے روشن چہرہ پر بادل کی زلف پریشاں ہو
فطرت کے حسیں نظاروں میں جب جذب نظر کے ساماں ہوں

یا انگڑائی لیکر اٹھے رنگین گلوں کے بستر سے
لے نیم شگفتہ کلیوں کی دوشیزہ فضا پر انگڑائی
جب دریا کے آئینہ میں وہ پرتو انجم رقصاں ہو
جب حسن کی رنگیں دنیا میں معصوم فرشتے خنداں ہوں

جب جگمگ جگمگ کرنے لگے پتی پتی ڈالی ڈالی
وہ روشن خواب بنے دنیا جو دیکھے جوگن متوالی

جب چاروں طرف خاموشی ہو بیہوشی ہو بدمستی ہو
فطرت کی مکمل خاموشی پیغام سکوں کا دیتی ہو

تو ایسے زریں لمحوں میں آ میری خیالی دنیا میں
رنگین تصور کی رنگیں پرکیف خماری دنیا میں

اک نغمۂ دلکش بنکر آ، اور دل کی گہرائی میں اتر
احساسِ مسرت بنکر آ اور چھا جا میری ہستی پر

پیکانِ لطافت بنکر آ، آئینۂ حیرت بن کر آ
تصویرِ شرارت بن کر آ، دردِ محبت بن کر آ

تسکین کی دنیا بنکر آ یا درد کا عالم بن کر آ
یا عیشِ مجسم بنکر آ، یا پیکرِ صد غم بن کر آ

پیمانِ الستی بنکر آ، بھولی ہوی ہستی بن کر آ
ادراک کی آنکھیں کھلجائیں، وہ عالمِ مستی بن کر آ

آ غمگیں زیست کا سرمایہ کردوں میں ترے قدموں پہ نثار
آنکھوں کے آنسو دل کی جلن ٹھنڈی آہیں صبر و قرار

مرجاؤں فرطِ مسرت سے دل میرا اتنا شاداں ہو
چہرہ سے عیاں ہو جوشِ طرب ہونٹوں پہ تبسم رقصاں ہو

پرنور ستاروں کے چہرے اس دم پژمردہ ہوتے ہوں
چاند اونگھ رہا ہو بادل میں اور دنیا والے سوتے ہوں

میری ایک رات

رات کا پچھلا پہر ہے سو گئی ہے کائنات
بے خبر ہر کشمکش سے ہو گئی ہے کائنات

ایک سنجیدہ خموشی ہے زمیں پر حکمراں
ایک گہری نیند میں سویا ہوا ہے آسماں

چاند شب کی آخری منزل کی جانب ہے رواں
اور ساکن دودیائی بادلوں کے بادباں

ہے افق کے سبز کہساروں پہ ماہِ زرد رو
پھیکی پھیکی مضمحل سی چاندنی ہے چارسو

جیسے دہقاں کی شکستہ حالیوں کا انتشار
یا کسی بیوہ کا ہو جیسے شبابِ سوگوار

پھول یوں مرجھا رہے ہیں گلشنِ افلاک کے
مُندمل ناسور ہوں جیسے دلِ صد چاک کے

یہ اُداسی یہ خموشی یہ جمودِ بے حسی!
موت کی آغوش میں سوتی ہے گویا زندگی!

ایک سناٹا سا ہے ہر چیز پر چھایا ہوا
اے خدا! سوتے ہیں کیا اس وقت سب بے خبر سوا؟

ایک دنیا تو خمارِ خواب میں مخمور ہے
ایک میں بھی ہوں کہ مجھ سے نیند کوسوں دور ہے

چٹکیاں لیتی ہے دل میں یاد اُن ایام کی!
دفن ہے اک داستاں جن میں دلِ ناکام کی!

دل میں ہے موہوم اور مبہم خیالوں کا ہجوم
اور تڑپاتے ہیں اس کو ڈوبنے والے نجوم

دور نامعلوم دھندلی سی فضاؤں میں کہیں
تھی مری تخئیل کی رنگین و روشن سرزمیں

اس جہانِ رنگ و بو سے اس فضائے نور سے
شعر و موسیقی کی رنگیں جلوہ گاہِ طور سے

وہ کہ جو ہے مطرب و مضرابِ سازِ زندگی
وہ کہ جو ہے بانیٔ سوز و گدازِ زندگی

وہ کہ نہلایا ہے میں نے اپنے اشکوں سے جسے
وہ کہ برمایا ہے میں نے اپنے نغموں سے جسے

اک سیہ چادر میں سارا جسم لپٹائے ہوئے
حُسن کی رقصیدہ موجیں اس میں سمٹائے ہوئے

ریشمی زلفیں کمر تک اپنی لٹکائے ہوئے
پشت پر کچھ اور کچھ سینہ پہ بکھرائے ہوئے

مست آنکھوں سے مئے گلفام چھلکاتا ہوا
جنبشِ لب سے حسیں نغمات برساتا ہُوا

ہر قدم پر سحرِ موسیقی کو ٹھکراتا ہوا
ذرہ ذرہ میں فضا کے رُوح دوڑاتا ہوا

آپ ہی اپنی اداؤں میں وہ بل کھانے لگا
مسکراتا جھومتا میری طرف آنے لگا

چپکے چپکے قلب کی گہرائیوں میں آگیا
رفتہ رفتہ رُوح کی پہنائیوں پر چھاگیا
نیند بنکر چھا گیا وہ میری چشمِ زار پر
اور ڈھلک کر گرم آنسو آگئے رخسار پر

بند آنکھیں ہو رہی ہیں نیند اب آنے لگی!
صبح کا تارا وہ ڈوبا اور سحر گانے لگی!

بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

ساز کو "سازی" کہنے والے
غم الفت کا سہنے والے
پردۂ دل میں رہنے والے
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

ہو گیا اب جو کچھ ہونا تھا
کھو دیا ہم نے جو کھونا تھا
روئینگے قسمت میں رونا تھا
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

میرا خزانہ میری دولت
تیری چاہت تیری چاہت
تیرا غم ہے میری امانت
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل میں ہردم ہوک اٹھیگی
روتے روتے عمر کٹیگی
میری دنیا خوب لٹیگی
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل کو ترا احساس بہت ہے
چاہ کا تیری پاس بہت ہے
جینے کو یہ آس بہت ہے
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

نئی دُنیا

مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

ہم آہنگیٔ فطرت سادگی مفہوم رکھتی ہو
مسلسل سوزِ الفت زندگی مفہوم رکھتی ہو
پرستش محویت وارفتگی مفہوم رکھتی ہو
سرور و سحرِ نغمہ خاموشی مفہوم رکھتی ہو
جہاں ہر بے حسیٔ غم ہنسی مفہوم رکھتی ہو

مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

کبھی بادل ہوا پر لوٹتا مستانہ وار آئے
برستا گنگناتا کوہساروں سے گزر جائے
فضا بھیگی ہوئی ہو پتہ پتہ پر نکھار آئے
درختوں ندی نالوں سبزہ زاروں پر بہار آئے
لبِ دریا شفق کا عکس ہو پودوں کے ہوں سائے
خمار و خواب کی دنیا میں فطرت ڈوب سی جائے

مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

سرِ مغرب زمین و آسماں جب کھوئے جاتے ہوں
شفق کے لالہ زاروں میں کشن مرلی بجاتے ہوں
اندھیری رات میں جگنو جہاں شمعیں جلاتے ہوں

جمالِ فطرتِ معصوم کا جادو جگاتے ہوں
رواں ہو بادلوں میں چاند تارے مسکراتے ہوں
کسی دنیائے نادیدہ کی جانب بہتے جاتے ہوں
مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

افق پر صبحدم سورج جو بل کھاتا ہوا آئے
جھجکتا کپکپاتا نور بکھراتا ہوا آئے
دھندلکے میں حسیں کرنوں کو پھیلاتا ہوا آئے
ستارے سوتے دریاؤں پہ برساتا ہوا آئے
شفق کے پردہ ہائے زر کو سرکاتا ہوا آئے
بہ اندازِ عروسِ نو وہ شرماتا ہوا آئے
مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

تمھارے مسکرانے پر جہاں غنچے چٹکتے ہوں
تمھاری سانس کی موجوں سے رنگیں گل مہکتے ہوں
تمھارے گنگنانے پر جہاں طائر چہکتے ہوں
تمھارے دیکھنے پر چاند اور تارے بہکتے ہوں
تمھیں مسرور پاکر چشمہائے کوہ ہنستے ہوں
تمھارے قہقہوں سے جانفزا نغمے برستے ہوں
مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائینگے

سراپا

چہرہ منور مہرِ درخشاں — عارض روشن ماہِ تاباں
برق نگاہیں تارے آنکھیں — کاکل پریشاں ابرِ بہاراں
گفتار دلکش گریز و شیریں — رفتار فتنۂ محشر بہ داماں
آواز لبریز موسیقیوں سے — رہزنِ دل مضرابِ رگِ جاں
ہر قہقہہ گویا قلقلِ مینا — ہر مسکراہٹ صبحِ خنداں
رنگین پیکر حسنِ شرابی — تخئیلِ فطرت تحصیلِ امکاں
جانِ ملاحت کانِ صباحت — از سر تا پا روحِ گلستاں
مستی سراپا شعرِ مجسم — حسنِ مکمل شاعر کا ارماں

اے ساز وہ دشمنِ ہوش آیا
مستانہ لغزش رقصاں خنداں

تو پھر یہ کیا کہا میری وفا کو بھول جاؤ گے

میں اپنی ساری راحتیں نثار تم پہ کر چکا
سکونِ طلب وفا کی منزلوں سے بھی گزر چکا
جب اپنی روح و قلب کو میں درد و غم سے بھر چکا
ھزار بار کہہ چکا کہ ہاں میں تم پہ مر چکا
"تو پھر یہ کیا کہا میری وفا کو بھول جاؤ گے"

سرورِ زیست بنکے تم فضائے دل پہ چھا گئے
نشاطِ مرگ کی طرح وجود میں سما گئے
میرے زمین و آسماں کچھ اور ہی بنا گئے
تم ہی تو ہو جو مجھکو اپنا بھولنا سکھا گئے
تو پھر یہ کیا کہا "میری وفا کو بھول جاؤ گے"

سما کے مجھ میں تم نے زیست کا نیا مزہ دیا
حیاتِ جاوداں کا درس رُوح کو پڑھا دیا
فضا کو اپنی مسکراہٹوں سے جگمگا دیا
تمام کائنات کو حسین تر بنا دیا
تو پھر یہ کیا کہا "میری وفا کو بھول جاؤ گے"

وہ مسکراہٹیں جو میرے دل میں جذب ہو چکیں
وہ آنکھیں جو مرے لئے ہزار بار رو چکیں
جو کیفِ رُوح میں نظامِ قلب کو ڈبو چکیں
میں ان کو بھول جاؤں گا جو مجھکو مجھ سے کھو چکیں
تو پھر یہ کیا کہا "میری وفا کو بھول جاؤ گے"

میرا وطن ہزار ہو

دامنِ کوہسار ہو	چادرِ سبزہ زار ہو
پاس ہی جوئبار ہو	موج بھی بیقرار ہو

بلبلِ دلفگار ہو ۔ نکہتِ گل نثار ہو
آتشِ لالہ زار ہو چاروں طرف بہار ہو

میرا وہاں مزار ہو

میرا وہاں مزار ہو

پھیلی ہو بوئے یاسمن پھول ہوں مثلِ سیم تن
گونجتا ہو گلوں کا بن جب ہوں طیور نغمہ زن
غنچہ بھی کھولدے دہن دیکھ کے بادۂ کہن
جبکہ شفق وہ گلبدن چرخ پہ آشکار ہو

میرا وہاں مزار ہو

میرا وہاں مزار ہو

پھیلی ہوئی پہاڑیاں شوخ ہوں جن کی مستیاں
سبز عمیق وادیاں جھوم رہی ہوں ڈالیاں
جھاڑیاں مثلِ کہکشاں رقص کناں ہوں تتلیاں
تختۂ گل کے درمیاں شورشِ آبشار ہو

میرا وہاں مزار ہو

میرا وہاں مزار ہو

سکسینہ ۔ مہندر راج ایم ایس سی (عثمانیہ)

[رباعیات کے مشکل میدان میں ان کی طبیعت اپنی جولانی دکھاتی ہے ۔ ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں بھی "میخانے" کی مستیاں موجود ہیں ۔ یہ خیام کی طرح صرف عشرت پسند نہیں بلکہ سکوں پسند بھی رہنا چاہتے ہیں انھیں دنیا کی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنے کی تمنا ہے ۔ صاف ستھری زبان اور لطیف خیالات کی وجہ سے ان کی رباعیاں اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتیں ۔]

رباعیات

ہوتا ہے مرا شمار میخواروں میں
مشہور ہوں رندوں میں، قدح خواروں میں
اِک گوشۂ میخانہ سنبھالے ہوں میں
جاتا نہیں سرکاروں میں، درباروں میں

کیا خوب کہ اس عمر میں توبہ کیجے
صاحب پیری میں شغلِ بادہ کیجے
پیمانۂ عمر ہے تہی ہونے کو
اب بھی جو نہ پیجئے تو پھر کیا کیجے!

کیا[1] شیخ کی سننا ہے، اِدھر آ پی لے
دو دن تو ملے ہیں زندگی کے جی لے
بجھنے کو ہے یہ شرر کسی لمحے میں
دو گھونٹ سہی، دوا سمجھ کر پی لے

---

[1] عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ہے ۔

پڑتا ہے مرا قدم قدم کے آگے
جاتا ہوں میں حیطۂ عدم کے آگے
ہوتا نہیں واں شیخ و برہمن کا گذر
منزل ہے مری دیر و حرم کے آگے

یہ منصب و جاہ پر اکڑنے والے
یہ نشۂ سیم و زر میں سڑنے والے
سن لیں کہ فلک کہتا ہے بابانگِ دہل
اک روز یہ ہیں زمیں میں گڑنے والے

اٹھ بادۂ زیست ہے ابھی تھوڑی سی
ساغر بھر لے کہ ہے ابھی تھوڑی سی
فکرِ فردا میں بے خبر وقت نہ کھو
پی لے باقی ہے شب ابھی تھوڑی سی

کیا جانئے قسمت میں ابھی کیا کیا ہے
حصے میں ابھی رہی سہی کیا کیا ہے
یوں بھی جو گزر جائے غنیمت جانوں
کس نے دیکھا ہے اور ابھی کیا کیا ہے

پیرِ گردوں کی سختیاں کم نہ ہوئیں
تقدیر کی چیرہ دستیاں کم نہ ہوئیں
دنیا ہر روز تنگ ہوتی ہی گئی
لیکن مری فاقہ مستیاں کم نہ ہوئیں

جھگڑے میں ہیں کفر و دیں کے دنیا والے
بندوں کو لڑا رہے ہیں اللہ والے
دنیا کو بنا چکے ہیں دوزخ لیکن
جنّت کی تلاش میں ہیں عقبیٰ والے

جو بات بھلی ہو اسکو سن لیتا ہوں
غیروں میں بھی ہوں اگر تو گن لیتا ہوں
باغِ عالم میں ہوں مثالِ گلچیں
کانٹوں سے بھی پھول چن لیتا ہوں

سروش ۔ ابوالنصر فتح اللہ مرحوم بی۔ اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس

[جامعہ عثمانیہ کا جوانمرگ ہونہار شاعر ہے۔ خوش ذوقی اور ذہانت بلا کی تھی، افسوس ہے کہ ترقی کی منزل پر لاکر موت نے انھیں ہم سے جدا کر دیا۔ عمدہ شاعرانہ ماحول میں انکے ذوقِ شعری کی پرورش ہوئی تھی۔ تخیل جوان، طبیعت میں دوڑ اور طرزِ ادا میں ایک بانکپن تھا۔ اگر یہ زندہ رہتے تو نظم میں انکا نیچرل رنگ اور غزل میں قدیم انداز کی شوخیاں بہت چمکتیں۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی جس میں جگہ جگہ خیال اور زبان کی بجلیاں سی کوندتی نظر آتی ہیں۔]

چاندنی رات

ہے شبِ مہتاب میں جلوہ چراغِ طور کا
چھا رہا ہے ہر طرف عالم یہ عالمِ نور کا

نور کی موجیں رواں ہیں آسماں پر چار سو
چاند سرچشمہ ہے گویا آبشارِ نور کا

چاندنی ہے یا ہے بحرِ پُرسکوں سیماب کا
یا زمیں پر فرش ہے اک چادرِ بلور کا

اتصالِ تیرگی و نور ہے خلدِ نگاہ
ہے یہ دورنگی دوپٹہ کس بہشتی حور کا

شعلۂ بارد ہے رقصاں پرتوِ مہتاب میں
اک جہانِ حُسن ہے اس نور کے سیلاب میں

یہ زمیں خاموش ہے وہ آسماں خاموش ہے
بادۂ راحت سے سب کون و مکاں مدہوش ہے

ہیں ستارے آسماں پر ہر طرف بکھرے ہوئے
نو عروسِ چرخ گویا سربسر گلپوش ہے

عندلیبوں کی ترنم ریز لب بیتاب ہوچکیں
محفلِ قدرت بسانِ گل سراپا گوش ہے

سازِ ہستی کی تلاطم خیز باتیں مٹ گئیں
ربطِ عالم سے پیدا نغمۂ خاموش ہے

مادرِ فطرت نے پھونکا ہر طرف افسونِ خواب
قلبِ شوریدہ مگر اب بھی ہے وقفِ اضطراب

کوئل

اے مطربِ سحر آفریں
اے طائرِ جادو نوا

تیرا ترنم دل نشیں
تیرے ترانے جاں فزا

پُر درد تیری کوک ہے
ہے پُر اثر تیری صدا

۲

تانیں تری سنتا ہوں میں
اک کنج میں بیٹھا ہوا

سنتا ہوں سر دھنتا ہوں میں
اک کیف میں ڈوبا ہوا

اے طائرِ جادو نوا
کیا سحر ہے نغمہ ترا

۳

آواز آتی ہے تری
لیکن نہیں تیرا پتا

لے مجھ کو بھاتی ہے تری
اے مطربِ غمگیں نوا

ہے مجھ کو تیری جستجو
کس جا ہے تو سچ سچ بتا

۴

اے غائب از اوجِ نظر
تو کس جگہ مستور ہے

یا تو کہیں اٹکا کس پر
دھرتی سے کوسوں دور ہے

یا تو فقط اِک نور ہے　　جو راگنی میں ڈھل گیا

۵

کیا جسم سے عاری ہے تو　　کیا تو محض آواز ہے؟
خاکی ہے یا ناری ہے تو　　ہستی تری کیا راز ہے؟

۶

کس سے تجھے تشبیہ دیں　　آخر بتا اے بے مثال!
تیری صفت کیوں کر کریں　　دوڑائیں کس کس جا خیال؟

۷

جیسے کوئی سانورستی　　اپنے سجن کی یاد میں
کاٹے جُدائی کی گھڑی　　اِک نغمۂ ناشاد میں
اور اُس کی خلوت گاہ سے　　آئے ترنّم کی صدا

۸

یا جیسے جوہی کی کلی　　یُوں کُنجِ جُھرمٹ میں نہاں
اک خندۂ زیرِ لبی　　کے ساتھ ہے نکہت فشاں
اور اُس کی نکہت دور تک　　پہنچا دے رہوارِ صبا

۹

مجھ کو بتا اے خوش بیاں　　مضمون اپنے گیت کا
ہے جنگ کی یہ داستاں　　یا کوئی جھگڑا بیت کا
یا سرگذشتِ وصل ہے　　یا دردِ فرقت کی کتھا

۱۰

کیا مور سے کرتی ہے تو — اپنی محبت کا بیاں
یا آم پر مرتی ہے تو — یا تو ہے اُس کی مدح خواں
جو ہر جگہ مستور ہے — جو ہر جگہ ہے رُونما

۱۱

مجھ کو سکھا دے اپری — یہ سُوز یہ طرزِ فغاں
یہ سحر یہ بےخودگری — سُن کر جسے سارا جہاں
بےخود ہو یوں جس طرح میں — اس وقت ہوں کھویا ہوا

گلہ

ہم پہ اگلی سی عنایات نہیں — کیا ہوئی بات کہ وہ بات نہیں
کیا وہ اب گردشِ دوراں نہ رہی — کیا وہ اب پہلے سے دن رات نہیں
کیا وہ اب نیّر و اختر نہ رہے — کیا وہ اب ارض و سماوات نہیں
کیا وجہ ہے کہ وہ اب تم نہ رہے — کیا وجہ ہے کہ وہ حالات نہیں
یا شب و روز تھا آنا جانا — یا مہینوں سے ملاقات نہیں
یا محبت کے تھے لاکھوں پیماں — یا عداوت کی بھی اک بات نہیں
ہے یہ اظہارِ حقیقت ورنہ — مجھ کو منظور شکایات نہیں
جو گذرتی ہے وہی لکھتا ہوں — میرے اشعار خیالات نہیں

دردِ دل کس سے بیاں کیجے سروش
کوئی مستفسرِ حالات نہیں

غزلیں

شرم کہتی ہے کہ تا چند تقاضا کیجے — شوق کہتا ہے کہ پھر عرضِ تمنا کیجے
دل ادھر وقفِ تقاضا ہے کہ بر من نگہے — وہ ادھر محوِ تغافل ہے کہ تڑپا کیجے
جی میں آتا ہے لگا دیجئے اس دہر کو آگ — اک نظامِ فلکی اور ہی پیدا کیجے
دل میں اپنے بھی نہاں ہے اثرِ سوز و گداز — شمع کی طرح مگر کس لئے چرچا کیجے
واہ کیا ابر ہے کیا موجِ ہوا کیا برسات — آج خالی خم و پیمانہ و مینا کیجے
شیخ جی آپ بھی واللہ غضب ڈھاتے ہیں — رند اور جام سے توبہ اجی توبہ کیجے
لطف دیتی ہے بگڑنے کی ادائیں کیا کیا — جی میں آتا ہے کہ پھر شکوہ بیجا کیجے
شغل ہے چاک گریبانی کا اچھا لیکن — آج کا دن تو گزر جائیگا کل کیا کیجے
آپ کو وحشئ زندانِ جنوں سے کیا کام — آپ گیسوئے مسلسل کو سنوارا کیجے

شمع خورشید بجھا دیجئے آہِ دل سے
شعلۂ عشق سے دنیا میں اجالا کیجے

۲

ہم برا کب کسی کو کہتے ہیں — اپنی ہی بیکسی کو کہتے ہیں
یہ جو میٹھا سا درد ہے دل میں — کیا محبت اسی کو کہتے ہیں
میرے رونے کا نام ہے باراں — برق ان کی ہنسی کو کہتے ہیں
بعدِ ناکامی یہ کھلا تقدیر — عقل کی بےبسی کو کہتے ہیں
یہ جو کہتے ہیں برق یا سیماب — دلِ مضطر تجھی کو کہتے ہیں

دل لگی کچھ نہیں لگانا دل　　درد دل کی لگی کو کہتے ہیں
عشق میں عرضِ مدعا کے لئے　　گفتگو خامشی کو کہتے ہیں
بے عمل جو ہے وہ نہیں زندہ　　کشمکش زندگی کو کہتے ہیں

۳

ایک لذّت ہے سیر دریا میں　　اک تماشا ہے کوہ و صحرا میں
سو مجالس ہیں کنجِ عزلت میں　　لاکھ نغمے ہیں قعرِ دریا میں
سُن نوائے سرود اے غافل　　نغمۂ آبشار و دریا میں
ہنس نہ سُن کر، ہزار مضموں ہے　　نالۂ عندلیب شیدا میں
کل تھا ساقی یہ عالمِ مستی　　کتنے مضموں تھے لغزشِ پا میں
اتنا ٹوٹا کہ فرق کچھ نہ رہا　　اُن کے وعدے میں میری توبہ میں
زاہدِ خشک اور رقص و سرود　　کتنی کیفیتیں ہیں صہبا میں

هم تو ڈھونڈیں گے وہ ملے نہ ملے
لطف مضمر ہے سعیِ بیجا میں

۴

کیوں مجھے اتنا الم دوست بنایا یا رب　　میرے ہنسنے میں بھی اِک غم کی ادا ہوتی ہے
ایسی رُک رُک کے نکلتی ہے فغاں سینہ سے　　جیسے اِک سازِ شکستہ کی صدا ہوتی ہے
اس پہ نفرین فدا اس پہ فصاحت قرباں　　خامشی اہلِ محبّت کی بھی کیا ہوتی ہے
یہ تو ممکن ہے کہ دِل مجھ سے جُدا ہو جائے　　پر کہیں دل سے تری یاد جُدا ہوتی ہے
داستاں اپنی جوانی کی سُنا اے واعظ　　اب تو پیری میں بہت یادِ خدا ہوتی ہے

پھر یہ موسیٰ سے سرِ طور الجھنا کیسا جب تجلّی ہی تری ہوش رُبا ہوتی ہے
التجا اہلِ تماشا کی ہے تجھ سے بے سُود خود نمائی تری خود پردہ کُشا ہوتی ہے
ہے بلاغت تری ترکیبِ بدن پر قرباں شاعری تیری نزاکت پہ فدا ہوتی ہے
حال کھل جائیگا رندوں پہ ترا اے زاہد دیکھ غماز بڑی لغزشِ پا ہوتی ہے

ہے خموشی ہی سروشؔ اس کے لئے کچھ موزوں
بات دل کی کہیں لفظوں میں ادا ہوتی ہے

سکسینہ ڈاکٹر رگھونندن راج ایم بی۔بی۔ایس (عثمانیہ)

[چھوٹے بھائی کی طرح انھیں بھی رباعیاں کہنے کا ذوق ہے۔ انھیں دیکھ کر ایک اور ڈاکٹر مل جاتا ہے جو پوست و استخواں کی دنیا میں رُوح کی لطافتوں کا دیکھنے والا ہے۔ یہ زندگی کی مسرتوں کے جلد گزرنے پر ایک آہ کرتے ہیں ان کے تخیل میں ایک قسم کی شوخی ہے' اپنا حساب بیباق کرتے ہوئے خدا سے انکا یہ کہنا
"کچھ تجھ سے ہوا ہے سہو کچھ مجھ سے ہوا
شاید بہت دنوں تک یاد رہے!]

رباعیات

گم کردہ رہی سے اپنی تھک جاتا ہوں
جادے سے گھڑی گھڑی بھٹک جاتا ہوں
مقصودِ حیات کو سمجھتا ہوں سراب
سایہ سے بھی اپنے میں کھٹک جاتا ہوں

ہر تیرِ ستم نشان پر آتا ہے
ہر مرحلہ اب تو جان پر آتا ہے
مرنے کی ہوس مری بناوٹ کیوں ہو
دل میں جو ہے زبان پر آتا ہے

احباب میں لطف کی وہ خوبو نہ رہی
بلبل میں وہ سوزِ عشق کی خو نہ رہی
دنیا سے اڑا ہے رنگ یکسر سب کا
پھولوں میں وہ رنگ روپ خوشبو نہ رہی

مستی بھی گئی شراب و کوزہ بھی گیا
ایماں بھی گیا نماز و روزہ بھی گیا
حاصل نہ ہوا نہ ہو سکا سرِ حیات
اس غم میں مگر دم دو روزہ بھی گیا

مسجود زمانہ میں سدا پریت رہی
ہر گوشۂ عالم میں یہی ریت رہی
عاشق کے اسی داؤں پہ پوبارہ ہیں
دنیا کی اسی پانسے پہ بس جیت رہی

گر حال برا ہے تو گنہگاروں کا
کچھ ٹھاؤ ٹھکانہ نہیں بیچاروں کا
آدھی ہے اِدھر جان خدا کے ڈر سے
واں عیش ہے دن رات خداداروں کا

تو روک لے گر ہاتھ تو پھر دیگا کون
مسجد سے میں ہٹ جاؤں تو پوچھیگا کون
سب میری یہ شیخی تری ہمت پہ تو ہے
تو کھل کے نہ بخشیگا تو بخشیگا کون

مت پوچھ کبھی پھر جو گنہ مجھ سے ہوا
دل مجھ کو دیا جرم یہ خود تجھ سے ہوا
لا آج حساب اپنا بے باق کروں
کچھ تجھ سے ہوا سہو کچھ مجھ سے ہوا

شکیب ۔ بدر الدین خاں بی ۔ اے، ال ال بی (عثمانیہ)

[اپنے مزاج کی طرح سخن تخیل اوصاف بیان پایا ہے ۔ بات ہمیشہ سیدھی کہتے ہیں ۔ ان کے کلام میں ایک ہلکی سی افسردگی پائی جاتی ہے جو دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی ۔ آفتاب کو جب نکلتا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں "نکلا ہے آفتاب بھی تھامے ہوئے جگر" مناظرِ قدرت پر ان کی شاعرانہ نگاہ پڑتی ہے تو کلام میں رنگینیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ غزل نہیں کہتے خیال کو ہمیشہ نظم کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں]

کاوشِ حیات

جہاں میں عیش و انبساط غم کا ایک نام ہے
سکون کہتے ہیں جسے وہ دردِ ناتمام ہے

خوشی کے لمحے یاد ایک خوشگوار خواب کی
سراب سی نظر فریب حقیقتیں شباب کی

نگہ کو حُسن کی تلاش، دل کو عشق کی ہوس
کشاکشِ حیات میں یہی ہے زندگی کا رس

ہے قیدِ قوتِ عمل مسرتوں کے جال میں
اُمنگیں کائناتِ دل کی غرق انفعال میں

ڈھئی ہوئی ہیں ہمتیں مٹے ہوئے ہیں ولولے
ہجوم آرزو سے پست ہو گئے ہیں حوصلے

نہ کہہ فسادگیٔ دل صدائے دردِ دین گئی
کہ حسرتِ دلِ حزیں نوائے دردِ دین گئی

عمل کی بجلیاں نہاں ہیں جنبشِ حیات میں
ہے رنگِ مہرِ نیم روز تابشِ حیات میں

آبشار

بزمِ ہستی میں مری زیست سراپا سیماب | قوتیں برق کی رگ رگ میں ہیں میری بیتاب
سازِ عشرت بھی ہوں اور غم کا ہوں پردرد رباب | دیکھنے والے پہ موقوف ہے میرا تب و تاب
اشک کی طرح رواں سلسلہ گوہر ہوں
اپنے سینہ میں دبائے ہوئے اک محشر ہوں

سوئے پستی جو بلندی سے گزر ہے میرا | ایک بجلی ہے کہ سیال جگر ہے میرا
شفقِ صبح کی رنگینی میں گھر ہے میرا | نالۂ دل بھی عجب زود اثر ہے میرا
چیر کر کوہ کے دل کو میں نکل آیا ہوں
کوئی فرہاد ہوں پتھر کا جگر لایا ہوں

میری افتادگی ہے باعثِ تزئینِ جہاں | شورشوں میں ہے مری ایک ترنم پنہاں
ہر ادا سے مری رنگینیٔ فطرت ہے عیاں | جوش ہوں کوئی سراپا کہ ہوں نطقِ یزداں
حق کی قدرت کا تماشا نظر آتا ہوں میں
ہے زبوں حال پہ آنکھوں میں سماتا ہوں میں

سراب حیات

زندگانی آہ یہ مایوسیاں | ایک دل اور سیکڑوں مجبوریاں
عشق کی دنیا ہے اک رنگین خواب | اک طلسمِ آرزو حسن و شباب
ہے ہوس اک بحرِ ناپیداکنار | اور مسرت گل پہ شبنم کی بہار

لالہ و گل موت کی تفسیر ہیں — اور بہاریں خود خزاں تعمیر ہیں
ذرّہ ذرّہ دہر کا ناپائیدار — زندگانی کا نہیں کچھ اعتبار
عالمِ حسرت میں جاں خاموش ہے — بیکسی سے زیست ہم آغوش ہے

ہاں مسرّت دہر میں ناپید ہے
زندگی موہوم سی اُمید ہے

طُلوعِ آفتاب

منظر ہے صبح کا کہ قیامت کی ہے سحر — یا انجمِ فلک کی جدائی کا ہے اثر
نکلا ہے آفتاب بھی تھامے ہوئے جگر — اور سُرخیٔ شفق سے ہے رنگین ہر شجر

دنیا ضیائے شرق سے حیراں ہو گئی
لیلائے شب کی بزم پریشاں ہو گئی

عشرت کدے سے شرق کے نکلا ہے آفتاب — اور دن میں جذب ہونے لگا حسنِ ماہتاب
فطرت نے اپنے چہرے سے الٹی سیہ نقاب — اور سرخیاں شفق کی گئیں ہو کے بے نقاب

اب نام کو جہاں میں سیاہی نہیں رہی
ڈھونڈو تو رات کی وہ تباہی نہیں رہی

مرغانِ خوشنوا کی نوا سنجیاں ہوئیں — کلیاں چٹک کے پھول میں تبدیل ہو گئیں
تھے عندلیبِ زار کی تربت پہ گل کہیں — شبنم کی بوندیں سبزے پہ بکھری جو دیکھ لیں

گوہر سمجھ کے مہر نے اُن کو اٹھا لیا
زینہ زمیں سے اُن کا فلک تک بنا دیا

ہونے لگی تمیزِ سفید و سیاہ میں — محسوس فرق ہونے لگا کوہ و کاہ میں
لذّت گناہ میں ہے نہ تاثیر آہ میں — نقشہ جہاں کا پھرنے لگا ہے نگاہ میں
باطل نے منہ چھپا لیا اور حق عیاں ہوا
دنیا پہ مہرِ نور فشاں حکمراں ہوا

حسینؔ ساگر کی شام

مائل بہ سکوں فضا ہے ساری — فطرت پہ ہے بے خودی سی طاری
دامن مغرب کا شعلہ رُو ہے — خورشید کا خونِ آرزو ہے
تالاب کا دور سے وہ منظر — رنگیں سیماب کا سمندر
پھیلی ہوئی نور کی ردا ہے — چشمِ گیتی فلک نما ہے
موجوں میں نہیں وہ اب تلاطم — فطرت کے لبوں پہ ہے تبسم
آسودگی چھا گئی جہاں پر — خاموشی ہے کتنی رُوح پرور
دن رات میں جذب ہو رہا ہے
اپنی ہستی کو کھو رہا ہے

کمالِ حیات

نصیب ہو اگر انساں کو جسم و عمرِ شجر — مثالِ برگدِ دیرینہ ہو قیام اگر
تو اس کا نام نہیں ہے کمالِ ذاتِ بشر — ہزار سال جئیں بھی تو کب فنا سے مفر
حسین تر تو وہ گل ہے جو وقتِ صبح کھلے
دکھا کے شام تک اپنی بہار مرجائے

اگرچہ عمرِ طبعی ہے گُل کی آٹھ پہر — یہ رنگ و بو نہیں دیکھے کسی میں ہم نے مگر
نہ اُس کی عمرِ بزرگ سی اور نہ وہ پیکر — مگر کہاں شجرِ پختہ اور کہاں گلِ تر

حقیر جن کو سمجھتے ہیں ہم حقیر نہیں
کمالِ ذات میں اُن کا کوئی نظیر نہیں

موجِ دریا

اے کہ تو ہستی سے اپنی اس قدر بیزار ہے — بحر کی وسعت میں پنہاں کونسا آزار ہے
کشمکش میں اس طرح کی درد کا آزار ہے — یا کوئی بھولا ہوا یاد آگیا اقرار ہے؟

تو سراپا رنج و غم ہے میں سراپا درد ہوں
خوف سے کیوں موت کے میں اس طرح سے زرد ہوں

وہ تری بیتابئِ دل، وہ تری زلفوں کا خم — وہ تلاطم خیز منظر اور وہ تیرا جوشِ دم
شورشوں میں تیری پنہاں ہے نوائے رنج و غم — ماہ تک جاکر پہنچ آتے ہیں جس کے زیر و بم

وہ کنارے سے غضب میں جا کے ٹکرانا ترا
ناامیدی پر بھی وہ ڈھارس کا بندھ جانا ترا

سچ بتا سیماب سا کیوں مضطرب ہے دل ترا — کیا مری نظروں سے پنہاں اور ہی ساحل ترا
میرے سینے پر تڑپتا ہے دلِ بسمل ترا — کیا قیامت ہے کہ خود محشر بھی ہے قائل ترا

دیکھ کر تجھ کو ہی کم ہوتی ہے بیتابی مری
تیری لوری سے فرو ہوتی ہے بے خوابی مری

اضطراب اے موج لکھا ہے ترے معصوم کا
حال ملنا جلنا ہے تجھ سے دلِ مغموم کا
کچھ مزا ہم کو چکھا دے عشقِ نامعلوم کا
رازِ پوشیدہ ہے کیا تجھ سے دلِ محروم کا
اے نگاہِ نکتہ بیں، تو یہ تماشا دیکھ لے
جلوۂ بینائیِ دریا کا نقشہ دیکھ لے

لبِ خاموش

یوں تو دل میں ہے مرے دریا نہاں جذبات کا
موج بن کر ساحلِ لب تک نہ آیا مدعا
غنچہ کو ہے انتظارِ آمدِ بادِ نسیم
یا اُمیدِ جلوہ میں خاموش ہے رازِ کلیم
ہے وہ طوفانِ معانی میرے ہر انداز میں
جو جھلکتا ہے حسینوں کی جبینِ ناز میں
کچھ اسی طرح تڑپ کر آہ بنجاتا ہوں میں
آنسوؤں سے کوہِ غم کو اپنے پگھلاتا ہوں میں
آئینہ ہوں میں خوشی کا رنج کا مسکن کبھی
میری جنبش میں تبسم ہے کبھی شیون کبھی

شمیم - نبی الحسن بی - اے (عثمانیہ)

[آزادی احساس و عمل کے پرستار ہیں۔ خودداری کا درس خوبی سے دیتے ہیں اور ایک عالم کیف میں انسان کی کامیابی اور نجات کے خواب دیکھتے ہیں۔ مزدور اور غریب انسان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں وطن اور اپنے ماحول کی محبت انھیں بیتاب رکھتی ہے۔ اپنی تلخ نوائیوں میں زندگی کی لطافتوں کو بھی نہیں بھولتے۔ نظم سے زیادہ غزل پر مائل ہیں۔ ابتداءً ان کے تخیل اور مزاج میں بہت جوش تھا اب پختہ کاری کا رنگ چڑھ رہا ہے۔ قدیم تغزل کو پسند کرتے ہیں بعض جگہ انکے جذبات کی تازگی اور خوبی زبان انکی شاعری کو بہت اُجاگر کرتی ہے۔]

طلوعِ صبح

نسیم صبح چلتی ہے بہارِ دلکشا لئے
فضائے کائنات ہے جمالِ جانفزا لئے

غضب کی دلفریبیاں ہے حُسنِ خودنما لئے
ہر ایک شکل سامنے ہے شانِ کبریا لئے

ابھی ہے آسمان پر سکوتِ شب کی یادگار
ستارہ رہ گیا ہے ایک صورتِ فنا لئے

درختوں کی یہ ٹہنیاں وفورِ شوق سے ہیں مست
کبھی گلے ملیں بہم، ہاتھ کبھی ملا لئے

جنھیں ہے شوقِ سیرِ گل جنھیں ہے ذوقِ رنگ و بو
نکل رہے ہیں باغ سے وہ پھول خوشنما لئے

وہ اک حسین مہ جبین اٹھی ہے خوابِ ناز سے
چلی ہے اب کنویں کی سمت سر پہ اک گھڑا لئے

سنہری رنگ کی کرن نے اور رنگ دیدیا
زمین پر جو ذرے تھے وہ لعل سب بنا لئے

گلوں کو خوف تھا بہت تپش کا آفتاب کی
اسی لئے اندھیرے منہ وہ اوس میں نہا لئے

سرور ہٹ رہا ہے کیا، یہ کیف کا اثر ہے کیوں
کہاں چلی ہے میکدے کو دوش پر ہوا لئے

صبا خرامِ ناز سے چمن میں کس طرح چلے
پڑے ہیں پھول ہر روش میں اس کا راستہ لئے

زمیں کا حسن دیکھ کر اسے بھی رشک آ گیا
بہشت دیکھتی ہے شکل اپنی آئینہ لئے

سکوتِ شب نہیں رہا مگر سکون پھر بھی ہے
طیور اڑتے پھرتے ہیں صفیرِ دلربا لئے

مادرِ ہند

روکشِ چرخ یہی گوشۂ جنت ہے یہی
چشمِ اغیار میں آئینۂ حیرت ہے یہی

مہرباں اس پہ ہے وہ قبلۂ حاجات بہت
اس نے پھیلائے ہیں قدرت کے عطیات بہت

زر لٹانے کو کلی گل کی نکلتی ہے یہاں
ہے یہ مشہور زمیں سونا اگلتی ہے یہاں

خوش فرشتے بھی ہیں ذروں کا تماشا کر کے
پھینک دیتے ہیں یہاں چاند کو چورا کر کے

ظاہری آنکھوں میں پنہاں ہیں بلا کے جلوے
پتھروں میں نظر آتے ہیں خدا کے جلوے

ساز کا لطف ہے ہر سانس میں سنتے ہیں رباب
دل کے پیمانوں میں ملتی ہے حقیقت کی شراب

نہ شرافت کی کمی اور نہ دولت کی کمی
ہے سپوتوں میں مگر ماں کی محبت کی کمی

بادل ادبار کے ہیں ان کے سروں پر چھائے
مرنا آئے نہ انھیں اور نہ جینا آئے

تنگدستی بھی ہے فاقے بھی ہیں بیماری بھی
اور امراض بھی ہیں عقل کی بیماری بھی

گرتے جاتے ہیں سنبھلنے کی کوئی آس نہیں
گو سفر دور کا درپیش ہے کچھ پاس نہیں

ایک ہنگامہ پہ موقوف نہ بیکار کریں
اب ضرورت ہے کہ ہر کام میں ایثار کریں

طرزِ عمل

بیہودہ جھگڑوں میں پڑنے سے ہیچ قوت کو بیکار نہ کر
جو کام بھی اپنے ہاتھ میں لے آسان بنا دشوار نہ کر

گھبرائیں جو حوادثِ عالم کے اک شان دکھا خودداری کی
احسان بڑھاتا رہ اپنا اس جوہر کو بیکار نہ کر

جس بات کا پورا ہو نہ یقیں خاموشی اس میں بہتر ہے
جو بات سمجھ میں آ جائے پھر اس سے تو انکار نہ کر

محدود سمجھنا اپنے کو بے عقلی ہے نادانی ہے
تو دل کو عمل سے پہلے ہی مجبور نہ کر ناچار نہ کر

اس منزلِ ہستی میں اپنی کانٹے نہ بچھانا جا غافل
جس راہ سے چلنا ہے تجھ کو اس راہ کو ناہموار نہ کر

یہ تیری کشتیٔ عمرِ رواں خود ساحل سے لگ جائیگی
تو بحرِ فنا میں بہتا جا اور فکر کوئی زنہار نہ کر

اس نیش زنی کے کیا معنی یہ چھیڑ نہیں اچھی ہے تری
جو فتنے جہاں میں سوتے ہیں سونے دے انھیں بیدار نہ کر

اوروں کے دلوں کو دکھ پہنچے جس بات کے کہدینے سے شمیم
تو اس کو دل ہی دل میں رکھ بھولے سے بھی اظہار نہ کر

تتلی

پھر اپنے پر پھیلا دئے گلشن میں پھر اڑنے لگی
ساری بہاریں دوش پر رکھے ہے پھولوں کی پری

ننھی سی تیری جان ہے، اور رنگ ہے کیا خوشنما
چھوٹا سا اک طاؤس ہے گویا ہوا میں ناچتا

تیرے پروں کے نقش ہیں، یا کھل گئے ہیں یاسمن
یا اب معلق ہو گئے دو قطعۂ صحنِ چمن

یہ نقش ہیں سا جے گئے قوسِ قزح کو توڑ کے
یا دو ورق گودے گئے اک نازنیں کے ہاتھ سے

یا باغِ جنت کے ملے گل بوٹے تجھ کو اے حسیں
یا اک درختِ سبز سے دو پتیاں ملکر اڑیں

ان کو ترنم کہو، یا جامِ صہبا سے بھرے
یہ نقش ہیں داغِ جگر، وہ بھی شمیم زار کے

مزدور

تیری ممنون ہے دنیا کی یہ ہل چل ساری   تیرا احساں ہے کہ نہریں ہیں عمل کی جاری
تیرے قربان کہ جب مائلِ تدبیر ہوا   خانۂ کعبہ ترے ہاتھ سے تعمیر ہوا
تجھ کو دیتے ہیں دعا مسلم و کافر دونوں   تیرے ممنون رہے مسجد و مندر دونوں
تجھ سے معمور رہیں تہذیب کے سب گہوارے   تیری کاوش کا نتیجہ ہیں تمدّن سارے
اپنی فطرت میں تکبر ہے یہ مجبوری ہے   ورنہ جو کرتے ہیں انسان وہ مزدوری ہے
تو نے فطرت کے ذخیروں پہ کیا ہے قبضہ   تیرے ہاتھوں سے تو بجلی کا اثر ہے پیدا
جوشِ ایثار کے راہوں میں دکھایا تو نے   اپنے مقصد کیلئے خون بہایا تو نے
موت سے خوف نہ اندیشہ ہے بربادی کا   اللہ اللہ یہ احسان ہے آزادی کا
اس غریبی پہ بھی تیرا ہے اثر لوگوں پر   آج بھی تیری حکومت ہے کئی ملکوں پر

کالج چھوٹنے پر

آتا ہے نیا دور کہیں چھوٹ رہا ہے   وارفتہ ہر اک گل سے چمن چھوٹ رہا ہے
احباب وہی بزم وہی اور وہی جوش   لیکن ہے شمیم جگر افگار فراموش
اُمڈے ہوئے آنسو ہیں اک تار لگا ہے   دل ہے کہ ستاروں کی طرح ڈوب رہا ہے
آئینہ سکندر سے جدا ہو تو غضب ہے   قطرہ جو سمندر سے جدا ہو تو غضب ہے
بے تابیٔ فرقت کی ہو تشہیر فضا میں   پھینکی گئی اک موج سمندر کی ہوا میں
وہ جوششِ ہنگامہ نہ آزادیٔ تقریر   معلوم ہوا پاؤں میں اب پڑ گئی زنجیر

حاصل ہیں مری عمر کے لمحات وہ سارے
ہنس کھیل کے صحبت میں جو یاروں کی گزارے

یہ سوچتا ہوں جب تو پریشاں نہیں رہتا
اک حال پہ قائم کبھی انساں نہیں رہتا

ممکن ہے کہ توفیق کبھی جس کو خدا دے
آئینۂ اخلاص میں کچھ اور جلا دے

قطرے بھی تو دریا کا کرم دیکھ رہے ہیں
ذرے بھی تو اک خواب عدم دیکھ رہے ہیں

بن جائیگا اکسیر یہ پروانہ بھی جل کے
کالج کے میں کام آؤنگا کالج سے نکل کے

غزلیں

دیکھوں انھیں تو طاقتِ صبر و قرار دے
بے اختیار کر کے خدا اختیار دے

بے تابیوں کے دم سے ہی سب لطفِ زندگی
پروردگار سب کو دلِ بے قرار دے

یں ان کے دل میں ڈال دو تھوڑا سا دردِ عشق
اللہ ایک دن جو مجھے اختیار دے

ساقی ترے نثار ترے جام کے نثار
اک بار جو دیا ہے وہی بار بار دے

یارب بیانِ حال سے کچھ فائدہ نہیں
مجھ کو زبان دے تو انھیں اعتبار دے

دنیائے غم کے ساتھ وجودِ شمیم ہو
جو ساری زندگی کو ہنسی میں گزار دے

۲

ان کے آگے ہیں میرے ہاتھ دراز
جن کو کہتے ہیں سب غریب نواز

ان کے قدموں پہ ہے جبینِ نیاز
ختم ہوتی ہے عمر بھر کی نماز

سب سمجھتے ہیں لامکاں اس کو
تھی یہیں تک خیال کی پرواز

دوسروں کے لئے تڑپتا ہے — دل نے سیکھے ہیں کچھ عجب انداز
عرش سے اس طرف نہیں رکتی — دل سے نکلی ہوئی کوئی آواز

آہ گونجی تھی اک فضا میں ضرور
نہ سُنی پھر شمیمؔ کی آواز

—— ۳ ——

جو تم خوش ہو تو دنیا مہرباں معلوم ہوتی ہے — تمہاری اک نظر سارا جہاں معلوم ہوتی ہے
ابھی آغاز الفت ہے سِتم کی نہیں عادت — بلائے آسماں بھی آسماں معلوم ہوتی ہے
جھکی ہیں اسکی آنکھیں اور میں خاموش بیٹھا ہوں — نگاہِ یار بھی میری زباں معلوم ہوتی ہے

شمیمؔ اب سر نہیں اٹھتا درِ دلدار سے اپنا
جبینِ شوق سنگِ آستاں معلوم ہوتی ہے

—— ۴ ——

آپ کبتک مسکراتے جائینگے — کیوں مرے زخموں کے منہ کھلوائینگے
زندگی کے ساتھ دنیا ختم ہے — یہ معمّے آج حل ہو جائینگے
میری آنکھیں روکے کرتی ہیں یہ ضد — نامہ بر کے ساتھ ہم بھی جائینگے

حشر میں سنتے ہیں اُلٹینگے نقاب
یعنی سب جنّت کے در کھلوائینگے

—— ۵ ——

پرواہ ہے کچھ اہلِ چمن کو نہ صبا کو — میں کیا کروں صیاد زمانے کی ہوا کو
ہشیار تو ہاتھ اٹھاتا ہوں دعا کو — کچھ دن کے لئے بھول گیا تھا میں خدا کو

گلزار میں یہ جا کے لگا دیجئے گلوں سے
اڑتی ہوئی مل جائے کوئی بات صبا کو

جاں دینا تو اک فرض ہے الزام نہیں ہے
بدنام کریں آپ نہ اربابِ وفا کو

کرتے ہیں ستم جس پہ عنایت ہی اوسی پر
میں جان گیا آپ کے اندازِ جفا کو

لاشہ پہ شمیم جگر افگار کے بولے
ہم بھول گئے آج ترے جرم و خطا کو

— ٦ —

میکشی کے قبل ہی بس ہوش سے بیگانہ تھا
یاد ہے ساقی کے ہاتھوں میں کوئی پیمانہ تھا

میں نے قدموں پر جو سر رکھا تو کیوں گھبرا گئے
یہ مری وارفتگیٔ شوق تھی، سودا نہ تھا

جل کے خاکستر ہوا سوزِ جمالِ حسن سے
دفترِ ہستی بھی گویا اک پرِ پروانہ تھا

بیخودی کے اک دھندلکے میں نظر آیا کوئی
یہ یقیں ہے کہہ نہیں سکتا کوئی تھا یا نہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے الٹ دی کائنات
ساقیا کیا گردشِ دوراں ترا پیمانہ تھا

ان کے کوچے میں کبھی پھرنا کبھی سر پھوڑنا
وہ بھی کیا دن تھے شمیم زار جب دیوانہ تھا

— ٧ —

بتا وہ پاس جو توڑا دلِ حزیں میں نے
مکاں مٹا کے بھی پیدا کیا مکیں میں نے

کبھی غشوں سے جو فرصت ہوئی جنوں ہوا
تمھارے راز کو رہنے دیا وہیں میں نے

وہ بے نیاز تھا مجھ کو بھی بے نیاز کیا
کسی کے در پہ نہ رکھی کبھی جبیں میں نے

ہنسی ہنسی میں زباں تیغ کی نہ کھل جائے
دہانِ زخم پہ رکھ دی ہے آستیں میں نے

بڑھی جو سوزشِ دل میں نے آشیاں پھونکا
کہ تم نے آگ لگائی کہیں کہیں میں نے

شمیم دردِ محبت کا کیا علاج کروں
خدا پہ چھوڑ دیا ہے دلِ حزیں میں نے

شنکر موہن لال - بی اے (عثمانیہ)

[اُردو شاعری کی طرف ہندی تخیل کے ساتھ مائل ہیں اور قدیم طرز کے جذبات کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی کی طرف ان کا میلان کسی قدر سرد ہی ہے۔ لیکن محبت کے راگ کو جو ہندی شاعری کی جان ہے حیات کا محرک بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی کامیابی ہے۔ زبان صاف ستھری استعمال کرتے ہیں اور خیالات میں بھی زیادہ الجھاؤ نہیں ہوتا]

مزدور دوشیزہ

آئی اک مزدور لڑکی آج میرے باغ میں
زخم ڈالے اور بھی جس نے دلِ پرداغ میں

حُسن کی تقسیم کا بھی کچھ عجب معیار ہے
دیکھئے قدرت بھی کیسی غیر جانبدار ہے

ایک کا ہے حُسن گر آرائشِ قصرِ شہی
دوسرے کے دم کی زینت جھونپڑے سے ہو گئی

الغرض تخصیص اسکی قوم و ملّت پر نہیں
آپ ہر طبقہ میں پائینگے حسین و مہ جبیں

ہاں تو اس مزدور دوشیزہ کی صورت دیکھکر
کہہ نہیں سکتا ہوا دل پر مرے کتنا اثر

اسکی طفلی ہو چکی تھی اب ہم آغوشِ شباب
یعنی وہ سن تھا کہا جاتا ہے جس کو لاجواب

اسکے اعضا کا تناسب اس کا حُسنِ دلفریب
رہزنِ ایمان و دیں غارت گرِ صبر و شکیب

چھپ سکا ملبوس کہنہ میں نہ حُسنِ بیمثال
آج دیکھا میں نے پہلی مرتبہ گدڑی میں لال

ہاتھ میں رنگِ حنا تھا اور نہ رُخ پر غازہ تھا
انتہائے سادگی میں حُسن بے اندازہ تھا

تھیں غلط انداز نظریں ہر طرف پڑتی ہوئی
اور دل میں دیکھنے والوں کے گھر کرتی ہوئی

بس کہ مشکل تھا سنبھلنا اپنے بارِ حسن سے — ہو رہے تھے پاؤں بے قابو خمارِ حسن سے
ٹوکری مٹی کی لائی سر پہ اٹھلاتی ہوئی — ہر قدم سے حشر کا انداز دکھلاتی ہوئی
دفعتاً دروازہ پر آکر اُسے ٹھوکر لگی — ٹوکری کے ساتھ ہی خود بھی زمیں پر گر پڑی
اس طرح گرنے سے اسکے ہوگیا میں بدحواس — اسکے چہرہ پر مگر قطعاً نہ تھا کچھ بھی ہراس
جھاڑ کر کپڑوں کو اپنے ہوگئی فوراً کھڑی — اور گر جانے پر اپنے کھلکھلا کر ہنس پڑی
دیکھنے والی نگاہوں سے جو تھی وہ بے خبر — ایک لمحہ تک رہی استادہ بے خوف و خطر
دیکھتے مجھکو جو دیکھا بے طرح گھبرا گئی — مسکراہٹ ان لبوں پر آئی اور شرما گئی
ٹوکری سر پر اٹھا کر باغ سے چلتی ہوئی — اپنے قدموں سے دلِ بیتاب کو ملتی ہوئی
آہ جسکے حسن پہ خود حسن کو بھی ناز ہو — سحر ہو رفتار میں گفتار میں اعجاز ہو
عرش سے اتریں فرشتے جسکے دینے کو خراج — جسکے قدموں پر تصدق ہوں شہنشاہوں کے تاج
جس پہ کردیں اہلِ دولت اپنا سیم و زر نثار — نکبت و افلاس سے ہو زندگانی اس پہ بار
چشمِ نظارہ کو جسکے حسن سے ہو ارتعاش — پیٹ کی خاطر اُسے کرنا پڑے کسبِ معاش

مشغلے ارماں یہ شایانِ بتِ کمسن نہیں
ٹوکری سر پر لئے پھرنے کے اسکے دن نہیں

بہار

پھر آیا موسمِ گل عاشقوں کی قدر دانی ہے — زمیں خود ہوگئی ہے آسمانی گل فشانی سے
نچھاور کر رہے ہیں اس قدر گل سبز پوشاں کا — کہ گلچیں بول اٹھیں باز آیا باغبانی سے
بہار آتے ہی گلشن میں عجب مستی سی چھائی ہے — کہ بوئے گل ہے بڑھ چڑھ کر شرابِ ارغوانی سے

ہوا ہے سُرخ غصّہ سے اگر لالہ جنبیلی پر ... تو نرگس دیکھتی چمپا کو ہے کس دلستانی سے

یہ ہے موسم کی حالت اور پھر ایسا بیاباں اپنا
نہ کیوں ارمان پھولوں انتہائے شادمانی سے

ایک ہندی عورت عالمِ خیال میں

میرے پریتم آؤ آؤ ... بنکے جوانی مجھ پر چھاؤ
آؤ مست فضائیں لے کر ... بھولی بھالی ادائیں لے کر

آؤ آؤ میرے پریتم

رات کو چھپ کر گاؤں میں آؤ ... تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آؤ
آؤ بھیگی بھیگی فضائیں ... کالی کالی مست گھٹائیں

آؤ آؤ میرے پریتم

دھندلے دھندلے سپنوں میں آؤ ... میرے مست احساس پہ چھاؤ
آؤ لب پہ تبسم لیکر ... ارمانوں کا تلاطم لیکر

آؤ میرے بھولے پریتم

پھولوں کی گھمبیر گھٹائیں ... برکھا رت کی مست ہوائیں
نینوں کے رس تم کو پلاؤں ... پریم کے نغمے گا کے سناؤں

آؤ اداؤں والے پریتم

بن میں پپیہا گونج رہا ہے ... پتہ پتہ مست ہوا ہے
آؤ لوٹیں ہم بھی بہاریں ... جھولا جھولیں گائیں ملاریں

کالی آنکھوں والے پریتم
آؤ بھولے بھالے پریتم

عالمِ فراق

آج نہیں وہ لطفِ صحبت
جوشِ شباب آغوشِ راحت
راز و نیاز و پیار و محبت
عشوہ و غمزہ و ناز و نزاکت
دل کی دنیا روح کی جنّت
سانولی صورت بھولی مورت
حسنِ یکتا حسنِ حقیقت
طور پہ مثلِ برقِ وحدت
شمس و قمر میں جلوۂ کثرت
آئینے میں نورِ وحدت
آنکھیں گویا گنگا جمنا
پیت کے پیاسے من کا رمنا
سر پہ بدلی ہاتھ میں مینا
لب پہ ہنسی بجلی کا چمکنا
میرے جوشِ دل کا بڑھنا

عارضِ گلگوں ابھرے جوبن
بانکی ادائیں ترچھی چتون
ماتھے پہ بندیا ہاتھ میں کنگن
پایل پاؤں میں باجے جھن جھن
جھولا جھولے گانا ساون
میگھ راج کی بھیگی برکھا
اندر کائنات اک راگ انوکھا
گھاس پھوس کی ٹوٹی کٹیا
دامنِ کوہ و ساحلِ دریا
اپنا انوکھا پریم بسیرا
دیکھو کیا ہے حسن کی مایا
اک ہی نظر میں ہوش اڑایا
اس نے سارے جگ کو پھنسایا
ہنستے ہنستے مجھ کو رلایا
دل کو میرے خاک بنایا

غزلیں

اب کہاں وہ لطفِ عیش سرمدی تیرے بغیر
اک عذابِ مستقل ہے زندگی تیرے بغیر

کالے کوسوں دور ہے مجھسے خوشی تیرے بغیر
ہر نفس ہے نوحہ خوانِ زندگی تیرے بغیر

صحنِ گلشن ہو لبِ دریا ہو یا میخانہ ہو
بجھ نہیں سکتی کہیں دل کی لگی تیرے بغیر

وہ تو یہ کہیے کہ تجھکو رحم مجھ پر آگیا
ورنہ برگشتہ تھی میری زندگی تیرے بغیر

یہ تو میں بھی جانتا ہوں ضبط کرنا چاہیے
اور اگر بڑھ جائے دل کی تشنگی تیرے بغیر

لکھ نہیں سکتا میں عنوانِ جوانی پر غزل
شاعرِ جادو بیاں میں یہ کمی تیرے بغیر

تیرے ہاتھوں میں نظامِ انبساطِ گلستاں
کس نے دیکھی گل کے ہونٹوں پر ہنسی تیرے بغیر

یوں تو ارماں شاعرِ شیریں بیاں پر رحم کر
آج کل پھیکا ہے رنگِ شاعری تیرے بغیر

۲

جاذبیت کچھ تو ہے آخر گدازِ شمع میں
خود فدا ہو جاتا ہے پروانہ پروانے کے بعد

ان کی محفل میں کسی نے میری چھیڑی داستاں
غیر بھی سنتا رہا افسانہ افسانے کے بعد

واں سے آئی ہے خبر مجھکو وجودِ یار کی
جس جگہ کچھ بھی نہیں معلوم ہو جانے کے بعد

کون کہتا ہے مری حالت میں تبدیلی ہوئی
تھی وہی جانے سے پہلے ہے وہی آنے کے بعد

جب ہوا بیدل تو پردہ غیریت کا اٹھ گیا
سوز میں بھی ساز آجاتا ہے دل جانے کے بعد

یوں تو سب ہی آتے جاتے ہیں سرائے دہر میں
ہے وہی اک مرد جو جی جائے مر جانے کے بعد

یہ جہاں ارماں کبھی منزل گہہ عشرت نہیں
یہ کھلا ہے راز ہم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد

٣

دل ہے خیالِ یار میں آنکھیں ہیں رہگذار میں	ایک عجیب لطف ہے عالمِ انتظار میں
میکدہ آج کھل گیا گل کدۂ بہار میں	شیخ جی کچھ تو پیجیے موسمِ خوشگوار میں
خرمنِ دل کی آگ پر عشق کی اوس پڑ گئی	خاک ہوئی ہیں حسرتیں آتشِ اضطرار میں
اب تو خدا کے واسطے جلوہ مجھے دکھائیے	جان بھی لب پہ آگئی آپ کے انتظار میں
یادِ جمالِ ہم نشیں تازہ ہوئی ہے خود بخود	ضبط کروں تو کس طرح دل نہیں اختیار میں
لطفِ حیات ہے یہی کیفِ حیات ہے یہی	بیٹھے رہیں اسی طرح عالمِ انتظار میں
رنگِ چمن کو دیکھ کر جان میں جان آگئی	غنچے کھلے تو کھل گئی دل کی کلی بہار میں

رند کی جس کو حرص ہو شیخ کی جس پہ آنکھ ہو
لائیے وہ شرابِ ناب ساغرِ زرنگار میں

٤

چاکِ دامن کوئی بسمل کوئی حیراں آیا	بزم میں تیری جو آیا وہ پریشاں آیا
وہ محبت کی کڑی منزلِ دشوار گذار	تیغ کے گھاٹ اتر کر ہوش ہی جاں آیا
یوں تو سینہ میں کئی تیر چبھائے تھے مگر	ناوکِ ناز مرے دل پہ نمایاں آیا
یہ تجاہل بھی عجب ہے کہ وہی پوچھتے ہیں	دل کو تھامے ہوئے یہ کونسا مہماں آیا
جب جنوں میں مجھے اپنا نہ پرایا سوجھا	چھوڑ کر کوہ و چمن سوئے بیاباں آیا
پوچھنا تھا خبرِ یار یہ پوچھوں کس سے	بے خبر آیا کوئی ششدر و حیراں آیا
وہ یہ کہتا کہ کہاں درد چھپا رکھا ہے	میں یہ کہتا کہ ہمارا کوئی پرساں آیا
نیند آتی ہی نہیں پہلے تو ارمانوں کو	چونک اٹھا خواب میں جب خواب پریشاں آیا

۵

اپنی ہستی سے بجز رنج کے ملتا کیا ہے
خود کو گم کر کے ذرا دیکھ کہ تو کیا کیا ہے

یاس و اُمید کی رہتی ہے کشاکش ہر دم
مدت العمر کا رونا ہے یہ جینا کیا ہے

عشقِ صادق ہو تو پھر اپنی خبر خود کو کہاں
چشمِ مجنوں میں بجز صورتِ لیلیٰ کیا ہے

محو رہتا ہے خیالِ رُخِ محبوب میں دل
بس یہی جانِ تمنّا ہے تمنا کیا ہے

چھوڑ کر ہستیٔ موہوم کی خودداری کو
آنکھ سے دیکھ لے تخلیق کا نشا کیا ہے

جو مقدر میں لکھا ہے وہ ملیگا بیشک
ہاتھ پھیلا کے کسی اور سے کہنا کیا ہے

دلق و سجادہ و تسبیح سب اچھے ہیں مگر
خدمتِ خلق سے بتلاؤ کہ اچھا کیا ہے

ایک مدت سے ہے خدمت کا یہ ارماں عامل
خادمِ قوم ہے تم نے اُسے سمجھا کیا ہے

عزیز ـ عزیز احمد ـ بی ـ اے (آنرز لندن)

[نام کی طرح ان کا کلام بھی بعض وقت عزیز بن جاتا ہے ـ دوران طالب علمی میں آرٹ کی بیداری نظر ہی کے ساتھ حسن وعشق کے موضوع پر چند اچھی نظمیں لکھی تھیں' اسکے بعد یورپ چلے گئے جہاں مطالعہ قدرت اور زیادہ تر مطالعۂ کتب سے ان کے ذوق میں تازگی اور روشنی پیدا ہوئی۔ "عمر خیام" ان کا وہ اپرا ہے جو اُردو زبان میں خاص ہے ـ خیالات میں لطف و نزاکت ہے' عام راستے سے ہٹ کر اونچا سوچتے' اور سوچ کر لکھتے ہیں ـ ان کی سرمستی شعر کیلئے اپنے سانچے اور زبان بنا لیتی ہے الفاظ کے ترنم سے زیادہ یہ ندرت خیال کے دلدادہ ہیں۔ "ڈراما اور نظم کو ملانے میں ان کی کوشش ایک خاص راستہ پیدا کر رہی ہیں ـ]

عمر خیام

ایک لی ریکل ڈراما

پہلا منظر

مدرسہ

وقتست کہ جام جہاں آرایند — در چشم سحاب چشمہا بکشایند
موسیٰ دستاں زشاخ کف بنمایند — عیساں نفساں زخاک بیروں آیند

مدرسے کے سامنے سبز قطعۂ زمین ـ حسن بن صباح' عمر خیام اور وہ طالب علم جس کو نظام الملک کا خطاب ملنے والا ہے
"آواز فطرت" کی آمد

آواز فطرت
بیک گراؤنڈ سے

وہ چیز جس کو طلسم حیات کہتے ہیں — جسے حجاب رخ کائنات کہتے ہیں

وہ شب کہ جس کو زمانے نے روز گردانا — وہ دن کہ جس کو زمانے میں رات کہتے ہیں
کسی پہ کھل نہ سکا اس کا راز دنیا میں — وہ شے جسے صفتِ بے صفات کہتے ہیں
شکست کھا کے ہوئی عقل سرنگوں آخر
طلسم ساز کا چل ہی گیا فسوں آخر

آواز فطرت

نظام الملک سے مخاطب ہو کر

بتا تو ہی تجھے اک دن نظام الملک ہونا ہے — تجھے کشتِ جہاں میں تخم انصاف کے بونا ہے
بتا تو ہی کہ اس ہستی کا آخر مدعا کیا ہے — سنا اس زندگانی جہاں کا ماجرا کیا ہے

نظام الملک

زندگانی اک فضائے لامکاں کا نام ہے — عکسِ روئے صانع کون و مکاں کا نام ہے
زندگی وہ خواب ہے تعبیر ہو جس کی فنا — ہستیٔ انساں، طلسمِ بے نشاں کا نام ہے
پھر بھی یہ ہستی حیاتِ جاوداں کا عکس ہے — زندگی انسانیت کے امتحاں کا نام ہے
زندگی کی شمع روشن ہے ازل کے نور سے — خاکِ انساں سجدہ گاہِ قدسیاں کا نام ہے

آواز فطرت

حسن بن صباح سے

حسن ابن صباح اب تو بتا — کہ انجام اس زندگی کا ہے کیا
ع: ازل سے تو نے سیکھا ہے کیا — کہ اس زندگی کا ہے کیا مدعا

حسن بن صباح

زندگی اک شورشِ آتش فشاں کا نام ہے — ذرہ ہائے مضطرب کے اک جہاں کا نام ہے
زندگی اک برق ہے خرمن جلانے کے لئے — زندگی کی موج خارِ آشیاں کا نام ہے
دہر میں شورش نہ ہو تو زندگی بے لطف ہے — زندگانی تیشۂ سنگِ گراں کا نام ہے
ہے ازل سے عالمِ فانی پہ ابلیسی اثر — خاکِ انساں، مشتِ خاکِ رائگاں کا نام ہے

بزدلی کا نام اُس دنیا نے نیکی رکھ دیا
رازِ عصیاں، زندگی کی داستاں کا نام ہے

آوازِ فطرت

عمر خیام سے

اے عمر خیام ہے تیری جبیں پر کیوں شکن
کس لئے خاموش ہے تو؟ کس لئے رنج و محن

زندگی کے رازِ پنہاں کی بھی کچھ تفسیر کر
تجھ کو ہونا ہے جہاں میں شاہِ اقلیم سخن

عمر خیام

زندگی خوابِ پریشانِ جہاں کا نام ہے
حاصلِ ہستی وبالِ جانستاں کا نام ہے

ہر قدم پر جس کو اک طوفاں کا اندیشہ رہے
زندگی اُس کشتیٔ بے بادباں کا نام ہے

جو خزاں کے خوف سے ہر لحظہ پژمردہ رہے
زندگی اُس سرو سبز بوستاں کا نام ہے

جس کے آنے کا پتہ ہے اور نہ منزل کا نشاں
زندگی اُس کاروانِ خستہ جاں کا نام ہے

جس کی تہ تک عقل و ہوش والے پہنچیں گے کبھی
زندگانی اُس طلسمِ جاوداں کا نام ہے

آوازِ فطرت

تعبیرِ خوابِ زیست تو یوں کر چکے مگر
تھا تین طاقتوں کا جُدا جا بجا اثر

تم کو ملی حیات، تو آغوشِ زہد میں
ابلیسیت میں آئی تمھیں زندگی نظر

تم کو ملی حیات شکستِ حیات میں
ٹوٹا جو جام، مستیٔ مے نے کیا اثر

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ تین قوتیں
بنتی ہیں دورِ زیست میں کس طرح راہ بر

ہوگا جہاں نظامتِ طوسی سے مستفید
صبّاح کے اصول سے پھیلے گا شور و شر
خیام پی کے بادہ کرے گا جہاں کو مست
اور دردِ دل سے چشمِ جہاں ہوگی خوں سے تر
ان تین طاقتوں میں رہے گی وہ کشمکش
جس سے رُخِ زمانہ پہ ہووے گا اک اثر

[آواز فطرت کے جانے کے بعد

حسن بن صباح

جہاں تسکین پاتا ہے فریبِ نورِ ایماں سے
مگر میں درسِ ہستی لے رہا ہوں شورِ عصیاں سے
گلستانِ جہاں پیکارِ خار و گل کا میداں ہے
کروں گا دامنِ گل چاک میں خارِ گلستاں سے
سکونِ عیش سمجھا دہر نے ہیجانِ ہستی کو
جگا دوں گا طوفاں بنکے اس خوابِ پریشاں سے
جسے ابلیسیت کہتی ہے دنیا اک کرشمہ ہے
لیا ظلمت میں درسِ زیست جس نے نورِ یزداں سے

نظام الملک

ہے عمرِ دو روزہ میں دعا بس یہ خدا سے
مقصد ہو مرا خدمتِ دیں فقر و غنا سے
مقصد ہو مری زیست کا ہمدردیٔ انساں
ہو مجھکو غرض گر تو ہو خالق کی دعا سے

عمر خیام

نکل کر اس جہانِ رنگ و بو سے جاوداں ہو جا
ابھر کر خاک کی بستی سے محوِ لامکاں ہو جا
یہاں ہنگامہ پرور خاک و باد و آب و آتش ہیں
تو ان سب سے گذر کر نورِ یزداں میں نہاں ہو جا
فریبِ عکس میں الجھا ہوا ہے عالمِ فانی
جمالِ رازِ ہستی کا جہاں میں ترجماں ہو جا

[پردہ]

دوسرا منظر

دربار

آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست
آں کس کہ بہ جملگی ترا تکیہ براوست
چوں چشم خود ار بازکنی دشمن اوست

[الپ ارسلان کا دربار]
[رقص و سرود]

ایک درباری
الپ ارسلان کی تعریف میں

دنیا جو آج خرم و فرخندہ کام ہے
ہر سو جہاں میں شادی و بہجت کا نام ہے
باقی رہے جہاں میں الپ ارسلاں کا دور
جس میں نظام ملک کا یاں انتظام ہے
الطاف اور فضل سے عالم ہے مستفید
تحصیلِ علم و فن کا غضب اہتمام ہے
ہے دشمنوں کے سر کے لئے تیغِ بے پناہ
اور دوستوں کو فضل و عنایت سے کام ہے
سیلابِ کامیابی و نصرت کے سامنے
اعدائے بدنہاد کا قصہ تمام ہے
ہیں دل سے محو قیصر و کسریٰ کی عظمتیں
سلجوقیوں کے دور کا وہ اہتمام ہے

الپ ارسلان
نظام الملک سے

نظام الملک تیرے فیض پر دنیا یہ کہتی ہے
کرے خورشید کو جو ماند اختر ہو تو ایسا ہو
بہے خوں ہو کے جو ہر دردِ دل کی داستاں سن کر
جہاں میں آہ کوئی دیدۂ تر ہو تو ایسا ہو

حسن بن صباح
[حسن بن صباح آتا ہے]

دورِ ہستی میں شہیدِ جلوۂ باطل ہوں میں
زندگی کا اک نشانِ سعی بے حاصل ہوں میں
شعلۂ باطل بھی اس دنیا کی ظلمت میں بجھا
دہر میں دودِ چراغِ کشتۂ محفل ہوں میں
قوتِ شر بھی مصافِ زیست میں ناکام ہے
ہو کے خوں جو بہہ چکا ہو آہ اب وہ دل ہوں میں

نظام الملک

(سفارشاً)

بزمِ ہستی سے پشیمانی عصیاں لیکر — ایک دل خستہ چلا دیدۂ حیراں لیکر
ہے ترے فضل و کرم سے مجھے امید کہ اب — یاں سے جائیگا نہ وہ قلب پریشاں لیکر
کوئی آفت زدہ آیا درِ دولت پہ ترے — جب گیا یاں سے گیا بخت درخشاں لیکر

الپ ارسلان

بس نظام الملک کی خاطر ہمیں منظور ہے — سلطنت کی شمع روشن اُس کے دل کا نور ہے
آج سے رکنِ حکومت ہم بناتے ہیں تجھے — سر پرستی ہم کو تیری ہر گھڑی منظور ہے

[نظام الملک جاتا ہے]

[موسیقی]

حسن بن صباح

یوں تو آساں زندگی ہے اک دلِ مجبور کے ساتھ — لطف تب ہے جب بسر ہو شاہدِ گلگوں کے ساتھ
یوں نظام الملک کے زہد ریا آمیز نے — سازِ عشرت کر دیا برباد اک افسوں کے ساتھ
جس طرح آئے خزاں صحنِ چمن کو لوٹ لے — اور رخصت ہو جوانانِ چمن کے خوں کے ساتھ

الپ ارسلان

(ملامت اور غصے سے)

کیا مروت کا یہی انجام ہے؟ — دوستی کیا بس اسی کا نام ہے؟
تیری ہر جنبش میں پنہاں اک فریب — رہزنِ ایماں ترا ہر گام ہے۔

[نظام الملک آتا ہے]

حسن بن صباح

دربار سے جاتے ہوئے

تمھارے سازِ عشرت کو پریشاں کر کے چھوڑوں گا
تمھارے خوں سے زخم دل کا درماں کر کے چھوڑوں گا

اجازت باغباں گلچینیوں کی گر نہیں دیتا
تو اس گلشن کو ہم رنگِ بیاباں کر کے چھوڑوں گا

یہی ٹھیری جو شرط زندگی سیلابِ ہستی میں
تو ہر قطرے میں پیدا زورِ طوفاں کر کے چھوڑوں گا

گنہ کی بجلیوں کی ضو فشانی سے مدد لوں گا
ترا خرمن نثار برقِ تاباں کر کے چھوڑوں گا

[جاتا ہے]
[عمر خیام آتا ہے]

نظام الملک

حضور شاہ یاں اک کاملِ فن آج آیا ہے
چمن سے راز دار سر گلشن آج آیا ہے

عمر خیام جس کے فیض سے دنیا منور ہے
چمن زار جہاں سے گل بدامن آج آیا ہے

الپ ارسلان

اے عمر خیام اے ملک سخن کے شہریار
خوش نصیبی سے ہوا اس شہر میں تیرا گذر

ہاں بتا دے گر تجھے جاہ و حشم درکار ہو
تیرے قدموں پر زمانے بھر کی دولت ہو نثار

عمر خیام

گر شاہدِ گردوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
پر قلبِ مصفا کی ضیا اور ہی کچھ ہے

ہے علم کی خدمت سے غرض مجھکو جہاں میں
مانا کہ زمانے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

آہنگِ طرب سے ہمیں دنیا میں غرض کیا
زخم دل محزوں کی دوا اور ہی کچھ ہے

سرشار ہے دنیا مئے گلگوں کی ضیا سے
پر تشنگی آبِ بقا اور ہی کچھ ہے

[پردہ]

منظر در منظر

تیسرا منظر

شاہراہ

ہر جا کہ گلے و لالہ زارے بودست — از سرخیٔ خونِ شہریارے بودست
ہر شاخِ بنفشہ کز زمیں می روید — خالے ست کہ بر رخِ نگارے بودست

[شاہراہ] [نظام الملک کے ماتم میں راہ گیروں کا ماتمی لباس]

[عمر خیام آتا ہے]

عمر خیام

ہنگامہ کیوں بپا ہے کہ ماتم کناں ہیں سب؟ — کیا ہو رہا ہے شہر میں کیوں نوحہ خواں ہیں سب!

راہ گیر

نظام الملک طوسی کی شہادت کا یہ ماتم ہے — اُسی کی موت کے غم میں سیہ پوش ایک عالم ہے
کیا دنیا کو مالامال جس کے فیض نے برسوں — اُسی فیاض و عادل کے گزر جانے کا یہ غم ہے
حسن صباح جس کے کارہائے شر کی شورش سے — بدی کی طاقت اس دنیائے فانی میں مسلّم ہے
شہید اُس نے کیا اُس پاک ہستی کو مکائد سے — کہ جس کے رنج و غم میں خوں فشاں اب چشمِ عالم ہے

عمر خیام

ماتم کے ساتھ آمدِ فصلِ خزاں ہے آج — ہر برگِ گل سے خونِ شہیداں عیاں ہے آج
ہر موج بحرِ زیست کی ہے قاصدِ فنا — طوفاں سے غرق کشتیٔ عمرِ رواں ہے آج
پیکِ اجل نے رازِ فنا کیوں بتا دیا — ہر سر پہ بارِ منّتِ سنگِ گراں ہے آج
تعمیرِ زندگی ہے اجل ہی کے واسطے — تارِ نفس میں سوزشِ برقِ تپاں ہے آج

[وقفہ]

عمر خیام

کیا خونِ تمنّا سے زمانے نے وضو برسوں — رہی برقِ تپاں کو خرمنوں کی جستجو برسوں

ہوئی جب خار و گل میں کشمکش صحنِ گلستاں میں
ہوا لُٹ کر پریشاں کاروانِ رنگ و بو برسوں

شہید ناوکِ بیداد ہر صید حرم ہے یاں
مٹایا دورِ گردوں نے طلسم آرزو برسوں

کبھی دنیا سکوں سے آشنا ہونے نہیں پائی
رہا شرمندۂ چاک گریباں ہر رفو برسوں

بس اب اے شاہد گردوں حسد کی انتہا بھی ہے
کہ ہر رخسار سے مٹتا رہا یاں رنگ و بو برسوں

دوسرا راہ گیر

حسن صباح بھی دنیا سے رخصت ہو گیا آخر
ہزاروں قتل کر کے جان اپنی کھو گیا آخر

عمر خیام

اجل گلشن میں پہلے آئی جو رباعناں ہو کر
گری پھر خرمنِ صیاد پر برق تپاں ہو کر

کوئی ظالم کوئی مظلوم دنیا سے ہوا رخصت
فنا کا راز باقی ہے صدائے الاماں ہو کر

فنا کے واسطے پیدا کیا دنیا میں انساں کو
ڈبویا نام ہستی زندگی نے رائگاں ہو کر

[پردہ]

چوتھا منظر

میکدہ

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما

برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

[میخانہ]

عمر خیام مغبچوں کی سنگت

[کوزوں کے انبار]

مغبچوں کی سنگت
بے رنج و تعب
اے لیلیٰ شب
ہنگام طرب
آتا ہے اب

روشن کوکب بھی فروزاں ہے اب مثلِ شعاعِ رحمت رب
اس رنج کا اس حرماں کا سبب؟ یہ شور و فغاں بیکار ہیں سب

عمر خیام

یہاں تک ہستی انساں کو غم نے تاک رکھا ہے ــ کہ ہر موجِ نفس میں خنجر سفاک رکھا ہے
خمیر جام بنتا ہے گل خاک حسیناں سے ــ مئے گلگوں ہے یا خونِ دلِ صد چاک رکھا ہے
مگر اب بادۂ صافی کو پی لے کچھ تو تسکیں ہو ــ یہ سامانِ شکست شیشۂ ادراک رکھا ہے

سنگت

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ــ ہے شاہد گل کا رخ روشن
پھر لالہ و ریحان و سوسن ــ سے رشکِ ختن ہے آج چمن
عشرت کے ترانے گانے کو
اور لذتِ غم کے مٹانے کو
پھر آج چمن میں جلوہ فگن ــ ہے شاہد گل کا رخ روشن

عمر خیام

برخیز و دوائے این دل تنگ بیار ــ آں بادۂ مشکبوئے گلرنگ بیار
اجزائے مفرح غم ارمی خواہی ــ یاقوت مے و بریشم چنگ بیار

سنگت

لو جام شراب کہ پھر گلشن ــ اب باد بہار کا ہے مسکن
اے مطرب پھر وہ طرز کہن ــ سب بھولیں جس سے رنج و محن
ہو جائیں جو ساقی کے درشن ــ تو آؤ لٹا دو تن من دھن

عشرت کے ترانے گانے کو

اور لذتِ غم کے مٹانے کو

پھر آج چمن میں جلوہ فگن　　　ہے شاہدِ گل کا رخِ روشن

[جام و چنگ کے ساتھ ساقی کی آمد]

عمر خیام

خیام اگر ز بادہ مستی خوش باش　　　با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش

چوں آخرِ کار نیست خواہی بودن　　　آں گاہ کہ نیستی چو ہستی خوش باش

مغنیے

وہ ضیائے طلعتِ مہ جبیں کہ مہ دو ہفتہ ہو شرمگیں　　　وہ ہوائے کاکلِ عنبریں کہ خجل ہو جس سے غزالِ چیں

وہ طلسمِ نرگسِ سرمگیں کہ جہاں ہے جس سے تہِ نگیں　　　وہ جمالِ عارضِ آتشیں کہ چمن میں رشک سے گل حزیں

(سنگت)۔　　　تری ہر جھلک بتِ نازنیں ہے شکیبِ عشق پہ نکتہ چیں

وہ فسونِ عشوۂ جانستاں کہ ہر ایک قلب ہے خونچکاں　　　وہ تبسمِ لبِ ارغواں کہ فروغِ محفلِ گل رخاں

مژۂ دراز ہے دلستاں کہ ہر ایک لب پہ ہے الاماں　　　وہ نگہ میں وسعتِ لامکاں کہ نگوں ہے گنبدِ آسماں

(سنگت)۔　　　تری ہر جھلک بتِ نازنیں ہے شکیبِ عشق پہ نکتہ چیں

ساقی کا گیت

خزاں ہونے کو ہے فصلِ شباب آہستہ آہستہ　　　بس اب جاری رہے دورِ شراب آہستہ آہستہ

مے رنگیں اگر ہو کامیاب آہستہ آہستہ　　　سکوں پائے دلِ پر اضطراب آہستہ آہستہ

ادھر ہو دخترِ رز بے حجاب آہستہ آہستہ　　　ادھر مستِ طرب چنگ و رباب آہستہ آہستہ

رخِ رنگینِ مے ہو بے نقاب آہستہ آہستہ

کہ ہو جیسے طلوعِ آفتاب آہستہ آہستہ

عمر خیام

بر روئے گل از ابر نقاب است ہنوز — در طبع دلم میل شراب است ہنوز
در خواب مرو چہ جائے خواب است ہنوز — جاناں مے دہ کہ آفتاب است ہنوز

[پردہ]

پانچواں منظر

لب آبجو

من ہیچ ندانم اے مرا آں کہ سرشت — از اہل بہشت گفت یا دوزخ زشت
توتے و بتے و بادہ بر لب کشت — ایں ہر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

[لب آبجو] [عمر خیام، ساقی، اور مغبچوں کی سنگت]

عمر خیام

سبزہ ہو چمن ہو اور مئے گلگوں ہو — چھایا ہر سو بہار کا افسوں ہو
موجود اگر ساقی گلفام رہے — دنیا کی مصیبتوں سے دل کیوں خوں ہو
دو دن کی اگر ہے زندگانی ساقی — رخصت ہونے کو ہے جوانی ساقی
تو ہو، مے ہو، بہار ہو، پھر کیا ہے — اک لمحہ ہے عمر جاودانی ساقی

["شاہد بہار" کی مجسم صورت میں آمد]

شاہد بہار کا گیت

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے — کہ آمد بہار ہے

بہار ہے جو دلستاں
تو ہے ہر ایک شادماں
طیور بھی ہیں نغمہ خواں
زمیں بنی وہ بوستاں
کہ آسماں نثار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

نکھار پر جو ہے چمن
گلوں پہ آج ہے پھبن
کلی ہر ایک خندہ زن
مہک رہی ہے یاسمن

ترنم ہزار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

کہیں بتانِ آزری
ہیں محو ناز و دلبری
غضب ہے جنگ زرگری
وہ عشوہ و فسوں گری

ہر ایک بے قرار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

جہاں میں ایک جوش ہے
کہ شورِ نائے و نوش ہے
یہ چشم مے فروش ہے
کہ گم شکیب و ہوش ہے

زمانہ مے گسار ہے

چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے

لیلیٰ شب

زمانہ مست ہے لیلائے شب کی چشمِ میگوں سے
نسیم جاں فزا آتی ہے کوہ و دشت و ہاموں سے

گلوں میں اک مسرت کی لہر سی دوڑ جاتی ہے
مہک اٹھتے ہیں غنچے بھی صبا کے رمزِ مکنوں سے

قمر نکلا لباسِ نور میں گلگشت کی خاطر
ستارے جھانکتے ہیں فصلِ گل کو بامِ گردوں سے

شبِ مہتاب میں محبوب ہو، ساغر ہو، مینا ہو
خجل ہو گلشنِ فردوس تک اس کیف افسوں سے

"دخترِ رز" کی آمد

دخترِ رز

دخترِ رز آئی ہے چشمِ دلستاں کھولے ہوئے
رازِ مستی کی نہفتہ داستاں کھولے ہوئے

ظلمتِ گردوں میں حسن و عشق ہو جاتے فنا
جام کی گردش ہے چشمِ دلبراں کھولے ہوئے

آتشِ سیال میں عکسِ جمالِ یار ہے
ہے سیہ مستی رموزِ جاوداں کھولے ہوئے

شورِ مینا نے چمن والوں کو حیراں کر دیا
رہ گئے گل لب بہ اندازِ فغاں کھولے ہوئے

مستِ نازِ حسن تجھ کو چشمِ میگوں کی قسم
اب تو آجا گیسوئے عنبر فشاں کھولے ہوئے

[تینوں شکلیں غائب ہو جاتی ہیں]

[عمر خیام کا ساغر ٹوٹ جاتا ہے]

عمر خیام

ابریق مئے مرا شکستی ربی
برمن درِ عیش را بہ بستی ربی

بر خاک بریختی مئے نابِ مرا
من مست نیم مگر تو مستی ربی

[وقفہ]

اک ادائے ناز سے ساغر کے ٹکڑے کر دیئے
پھر ستمگر نے دلِ مضطر کے ٹکڑے کر دیئے

بیخودی کا راستہ جس نے بتایا دہر کو
رہزنِ گردوں نے اس رہبر کے ٹکڑے کر دیئے

شعلۂ دل کو بجھا کر صبر آ جاتا تجھے — کیا ستم ہے مشتِ خاکستر کے ٹکڑے کر دیئے
ہے سکوں اِس عرصۂ ہنگامہ پرور میں محال — ظلمتِ شب نے مہ و اختر کے ٹکڑے کر دیئے

[وقفہ]

دلِ مضطر فنا کا راز داں معلوم ہوتا ہے — کہ راز بینشِ اب جاوداں معلوم ہوتا ہے
حبابِ بیخودی کو اس جہاں میں عیش کہتے ہیں — اسیروں کو قفس ہی آشیاں معلوم ہوتا ہے
فریبِ دید سے دنیا میں ہر دم سیہ بختی — خیالِ گیسوئے عنبر فشاں معلوم ہوتا ہے
مگر پھر نیستی اس خوابِ ہستی سے جگاتی ہے — تبسم بھی اک اندازِ فغاں معلوم ہوتا ہے
فنا کے جام میں آبِ بقا لیکن ہے پوشیدہ — فنا کا رازِ ہستی کا نشاں معلوم ہوتا ہے
نگاہِ غور سے تعمیرِ ہستی کو اگر دیکھیں — زمیں کا ذرہ ذرہ آسماں معلوم ہوتا ہے

[طویل وقفہ]

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو — آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

[حسن ابن صباح کی روح داخل ہوتی ہے]

عمر خیام

حسن ابن صباح کی روح کیوں — یہاں آئی ہے اس طرح سرنگوں

حسن بن صباح کی روح

مرا تو نام بھی دنیا بھلا چکی لیکن — زمینِ شعر کا وہ شہریار باقی ہے
نشانِ زہر نہ باقی رہا زمانے میں — مگر شرابِ سخن کا خمار باقی ہے

[حسن بن صباح کی روح غائب ہو جاتی ہے]

[نظام الملک طوسی کی روح داخل ہوتی ہے]

نظام الملک کی رُوح

جسے زمانے نے رند جانا طلسمِ ہستی کا راز داں ہے
اُسی کی عظمت کا آج چرچا زمیں سے تا حدِ آسماں ہے
سمجھ سکا گر نہ اُس کو زاہد قصور تنگیٔ نظر کا
ملی حقیقت وہ بے خودی میں نثارِ خود گلشنِ جناں ہے

غائب ہو جاتی ہے

رقص و سرود

عمر خیام

من ظاہرِ نیستی و ہستی دانم — من باطنِ ہر فراز و پستی دانم
با ایں ہمہ از دانشِ خود شرمم باد — گر مرتبہ ورائے مستی دانم

[پردہ]

مخدوم محی الدین - ایم۔اے (عثمانیہ)

[اُن کے مزاج اور کلام میں ایک قسم کی وارفتگی اور بے باکی ہے۔ آرٹ کے مندر میں ہوشیار جاتے اور دیوانہ وار واپس آتے ہیں۔ شعر میں خیال اور جذبے کی دلچسپ آمیزش ہوتی ہے۔ نئے مضامین کے ساتھ نئے الفاظ کی تلاش کرتے، لیکن اپنے شعر کو قید و بند سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی آواز کو کہکشاں میں ڈوبتی ہوئی دیکھ کر یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ حریم عرش کو چھو کر آگے نکل جائے' قلندر' کی طرح ان کی نگاہوں کی زد آسمانوں پر رہتی ہے جب کبھی زمین کی طرف دیکھتے ہیں محبت یاد آتی ہے یا وہ کثافتیں نظر آتی ہیں جو ابن آدم نے اپنے ہاتھوں پیدا کی ہیں۔ اُن کا طنزیہ بہت پر تکلف ہے 'مشرق' 'قلندر' اور 'ٹوٹے ہوئے تارون' میں ان کا مشرب صاف نظر آرہا ہے]

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مساں

وہم زائیدہ خداؤں کا، روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی لاش بے گور و کفن، ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں ہُو نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ و بے رُوح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحاب کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائیگا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا!

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے / فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
نوائے دردِ مری کہکشاں میں ڈوب گئی / وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا / زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا
وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارا نہ تھا / وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہ پارہ نہ تھا
دلوں میں بیٹھ گیا تیرِ آرزو بن کر / فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر
یہ ساکنانِ فلک دردوغم کو کیا جانیں / یہ خاکیوں کی رہِ بیش وکم کو کیا جانیں؟
وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے / زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے
فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے / زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیرِ آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی!

قلندر

[چغتائی کی تصویر "قلندر" کو دیکھ کر]

تری نظروں کی زد کو آسماں والوں سے پوچھونگا / مکاں والوں سے کیا میں لامکاں والوں سے پوچھونگا
ہنرور کو صلہ صنعت گری کا مل گیا ہوگا / قلندر کی نظر کو دیکھ کر دل ہل گیا ہوگا

جنوں کو عام کر دے دہر کو زیر و زبر کر دے
انہیں بے باک نظروں کو ذرا بے باک تر کر دے
غلط آہنگ سازِ زندگی برباد ہو جائے
جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے
نزارِ فصلِ جنوں ہم سازِ اسرافیل ہو جائے
یہ بزمِ غیر بزمِ خاص میں تبدیل ہو جائے

مسیحا دم گلِ فردوس کھلتا جا مہکتا جا
حرم کی لاش پر داؤد کے نغمے چھڑکتا جا

انتظار

رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان بر افگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آگئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اِک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

ساگر کے کنارے

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے
وہ اُن کے بھجن پیار کے وہ گیت اُن کے سہانے

تاریکیٔ شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں
تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے

وہ چھاؤں میں تاروں کی وہ کھیتوں کے کنارے
دہقان بھی بھیروں کی لگا تان اڑانے

کوئل نے کسی کنج سے کو کو کی صدا دی
مرغانِ چمن گانے لگے صبح کے گانے

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفانِ جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لیے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتریٔ حسن کے انمول نگینے
سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

چہروں کو کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

پرسہ

نہ رہ ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے

ترے دل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا

ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں

مرادوں کو بر لانے والی دعائیں
نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

نامۂ حبیب

کہا ہے مجھ سے جنگل کی ان آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

کہ تم کو حسن کی نامہربانی سے شکایت ہے
تمھیں کبھی کلی کی بے زبانی سے شکایت ہے
گنہ نا آشناؤں کی جوانی سے شکایت ہے

کہا ہے مجھ سے جنگل کی ان آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

سنا ہے ضبط کو تم دل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوفِ رسوائی کو خود بینی سمجھتے ہو
یہ کیا سچ ہے مرے آنسو کو رنگینی سمجھتے ہو

کہا ہے مجھ سے جنگل کی ان آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

جفا پرور اداؤں سے سنورنے کے ارادے ہیں
خدا کے عرشِ الفت سے اترنے کے ارادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں

کہا ہے مجھ سے جنگل کی ان آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

موت کا گیت

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

ظلمت کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگ خونخوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمن جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں

جاگ اٹھنے کو ہے اب یوں کا تلاطم دیکھو ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں

دور ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا روح انسان کو آزاد کیا جائے گا

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کیلئے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کیلئے
قصر شداد کے دربند ہیں بھوکوں کیلئے

پھونک دو قصر کو گرگن کا تماشا ہے یہی زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی عثمانیہ

[ایک زمانے میں میخانۂ شعر کے رند قدح خوار تھے ۔ وکالت نے انھیں اب سیاست کے میدان میں پہنچا دیا ہے ۔ فلسفے کے نمایاں طالب علم رہ چکے ۔ فلسفیانہ تخیلات کو شعر کے جذبے کے ساتھ ملاتے تھے اور اس میں ایک خاص اثر پیدا کرتے تھے ۔ جو نظمیں یہاں درج ہیں وہ اسی دورِ قدح خواری کی یادگار ہیں]

شباب

یادگارِ طفلی ہے تیری ہستئ بیتاب
خلد سے نکل آیا ذوقِ آگہی میں تو
ایک شورشِ محشر تیری زمزمِ دل میں ہے
بیرِ عقل سے تجھ کو، شوق رہنما تیرا
اشکش تیری نظروں میں موجۂ تبسم ہے
آنکھ ہے کہاں تیری آشنائے کیف و کم
ہر قدم پہ ہے لغزش ہے نگہ میں بیتابی
ہے ابھی تہی دامن حسن کے گلستاں میں
رنگ ہے ابھی غالب تجھ پہ عہدِ طفلی کا
اے فریب خوردہ تو پیکرِ تلون ہے

جسمِ زندگی میں تو ایک دیدۂ بے خواب
ڈھونڈ اب سکونِ دل سوزِ زندگی میں تو
برق کی تپش پنہاں تیرے آب و گل میں ہے
عاقبت کا تو دشمن عیش مدعا تیرا
درد کی صدا گویا شورشِ ترنم ہے
سیمیائی جلوے ہیں کیا حقیقتِ محکم؟
سر پہ اک نشہ طاری دل میں کیف سیمابی
کوئی گل نہیں جچتا کیا نگاہِ حیراں میں
حسن تیرے ہاتوں میں اک کھلونا ہے گویا
تیری جبہ سائی بھی شاید اک تفنّن ہے

اک گریز پا نظر تو ہے زندگانی کا
پھر بھی کیا سہانا ہے خوابِ سرجوانی کا

چاندنی رات

منظر یہ آسماں کا کیا جاذبِ نظر ہے
ظلمت کدے میں شب کے ہنگامۂ سحر ہے

اے ماہ! یہ بھی تیرا اعجازِ دلکشی ہے
موجوں میں بیکلی ہے، تاروں میں خامشی ہے

عکسِ قمر سے دریا، ہم رنگِ آسماں ہے
گویا رواں زمیں پر انجم کا کارواں ہے

گرما رہی ہے دل کو تاثیر چاندنی کی
سینے میں دوڑتی ہے اک لہر زندگی کی

اس ٹھنڈی روشنی میں اک کیفِ بیخودی ہے
جس کے اثر سے فطرت بیہوش ہو گئی ہے

دلکش ہے گوشبِ مہ، پر یاس آفریں ہے
حاصل دلِ حزیں کو، یاں بھی سکوں نہیں ہے

اس جنتِ نظر میں، دل محوِ اشکباری
اضداد پر ہے قائم، یہ زندگی ہماری

تاروں کی انجمن میں حرکت بھی ہے سکوں بھی
شاعر کے ذہن میں ہے کچھ عقل بھی جنوں بھی

دل کی دنیا

شاعر کے دل کا کاشانہ
ہے ساقیِ عشق کا میخانہ

اک عالمِ سوز و گداز ہے یہ
اک نغمۂ بے آواز ہے یہ

یاں کاہشِ سود و زیاں ہی نہیں
یاں قیدِ زمان و مکاں ہی نہیں

یاں آغاز اور انجام نہیں
یاں شام و سحر کا نام نہیں

یاں آہوں میں ہے موسیقی — سامانِ طرب لذت غم کی
یاں شمعِ تاثر کی ہے ضیا — گل عقل و حکمت کا ہے دیا
یہ حُسن و عشق کی وادی ہے — وجدان کو یاں آزادی ہے
ہے جرمِ محبت حسن و عمل — اور دل کا سکوں پیغامِ اجل
جو نغمہ تری آواز میں ہے — وہ دل کے شکستہ ساز میں ہے

آ تو بھی دل کی بستی میں
گم ہو جا حُسن پرستی میں

میکش ۔ صاحبزادہ میر محمد علیخاں (عثمانیہ)

[جذبات کا پیمانہ سرشار رہتا ہے۔ تخیل میں جوش ہے جس کو دیکھ کر بعض وقت دل گھبراتا ہے۔ آجکل آزادی اور عمل احساس اور خودداری کے نغمے گا کر قوم کی خرابیاں دور کرنے کی فکر میں ہیں، مگر ان کے کلام کا اصل لطف ان کی محبت بھری ترنگوں میں ہے جہاں ان کا شباب پنپا پورا رنگ دکھاتا ہے۔ طعن و طنز کے ذریعے چٹکیاں لینے کے عادی ہیں۔ غزل میں ان کا تیکھاپن اور شوخی ایک گدگدی سی پیدا کرتی ہے۔ لفظی ترکیبوں پر خوب حاوی ہیں۔ رنگین بحروں میں غزل اور اپنے انداز کے سانچوں میں نظم دلکشی سے ڈھالتے ہیں]

شاعر

خیالِ ناقدری ہے نہ فکرِ کینہ وری
شباب و شعر نے دی ہے مجھے وہ خبری

ہے میری آنکھ میں گلزارِ رنگ و بو آنسو
مری زبان پہ نغمہ ہے، نالۂ سحری

مری نگاہ گذرتی ہے آسمانوں سے
مری نگاہ میں یہ بھی ہے ایک کم نظری

کوئی نقاب نہیں ہے عروسِ فطرت پر
کہ میری چشم بصیرت ہے سحر جامہ دری

ہزار بار گری برق غم، جلا نہ سکی
مجھے ملی ہے ازل سے متاعِ خوش بسری

مرے خیال کی دنیا مٹا نہیں سکتی
زمیں کی گردشِ پیہم، فلک کی فتنہ گری

مرا خمارِ محبّت، اتر نہیں سکتا
مرے جنوں کو نہیں، احتیاجِ بخیہ گری

بہل ہی جاتا ہے دل، یادِ دوست کی سوگند
نہیں ہے فکر کو میری تلاشِ چارہ گری

مجھے سکوں نہیں ملتا ہے اضطراب بغیر — ہے میری جرأتِ ہستی میں شانِ بے جگری
رہِ قرار پہ ہر وقت جادہ پیما ہوں — مرے قدم کو نہیں انتظارِ راہبری
مری رگوں میں مچلتا ہے نوجوان لہو
کہ جیسے ساغر و مینا میں موجِ مے کی پری

نظام ساگر اور چاندنی رات

مہتاب کی کرنوں نے کیا جلوۂ رنگیں — سیلابِ منوّر میں ہوئی جنبشِ سیمیں
امواج کے شانوں پہ پڑی چادرِ زریں — فطرت ہے مخیّر تو بنے ہیں یہ نظارے — ساگر کے کنارے

اس منظرِ رنگین میں ہے بزمِ چراغاں — اس بارشِ انوار میں ہے نغمۂ پنہاں
اس چادرِ سیماب میں ہے حسن فراواں — دنیا میں نظر آتے ہیں جنت کے نظارے — ساگر کے کنارے

موسیقی سے معمور ہیں خاموش نوائیں — ڈوبی ہیں سکوں خیز شرابوں میں ہوائیں
مستی سے ہم آہنگ ہیں پُرنور فضائیں — جادو نہ جگائیں کہیں بیدار ستارے — ساگر کے کنارے

ہیں خلدِ نظر فطرتِ معصوم کے گلشن — تالاب نے پھیلائے ہیں تقدیس کے دامن
ہر پرتوِ مہتاب میں ہیں حسن کے مامن — قدرت کے نگینے ہیں درخشندہ ستارے — ساگر کے کنارے

اس خاک کا ہر ذرۂ تاریک ہے گوہر — اس بحر کا ہر قطرہ ہے ذخّار سمندر
اس باغ کا ہر خار ہے صد رشکِ گلِ تر — کچھ اور ہی انداز نظر آتے ہیں سارے — ساگر کے کنارے

مہتاب درخشاں ہے کہ شہ پارۂ جنت — پانی کا تموج ہے کہ گہوارۂ جنت
تالاب کا کٹا ہے کہ نظارۂ جنت — فردوسِ بریں سے یہ اتر آئے ہیں سارے — ساگر کے کنارے

جذبات میں ہیجاں ہیں تالاب کی موجیں — تارِ نگہِ شوق ہیں جذبات کی لہریں

بہتی ہیں ہر اک کنج میں انوار کی نہریں　دریائے تجلی میں اُبلتے ہیں شرارے　ساگر کے کنارے

بغاوت

ہر سانس میں ڈوبی ہوئی آہوں کا اثر دیکھ
لہراتے ہیں ہونٹوں پہ مرے برقِ شرر دیکھ
کھنچ آئی ہے تلواروں کی دھاروں پہ نظر دیکھ
انسان درندے ہیں اگر جینے نہ دونگا　مزدور کا معصوم لہو پینے نہ دونگا

لاؤنگا جہنم سے گناہوں کی سزائیں
طوفان سے مانگوں گا تباہی کی ادائیں
سیکھوں گا سمندر سے تلاطم کی جفائیں
اس عالم ناپاک کو برباد کروں گا　روحوں کو غلامی سے میں آزاد کروں گا

جب تک نہ مٹیں خون سے رنگین نگینے
ہو جائیں نہ غرقاب امارت کے سفینے
لٹ جائیں نہ لوٹی ہوئی دولت کے خزینے
سوگند ہے بھونچال کی آرام نہ لونگا　اس راہ میں رکنے کا کبھی نام نہ لونگا

تلوار کو چومے ہوئے ہونٹوں کی قسم ہے
اُبھرے جو چٹانوں پہ یہ وہ نقشِ قدم ہے
مظلوم کے ہاتوں میں بغاوت کا علم ہے
اب دل کے ہر اک داغ کو دکھلا کے رہونگا　اب یہ تو نہ ہوگا کہ میں گھبرا کے رہونگا

وادی

ساون کی رُت جھوم رہی ہے   روح سی گویا گھوم رہی ہے
رنگیں تتلی پیت کے مارے   ہر غنچے کو چوم رہی ہے
منظر کی خاموش فضائیں   ایک جوانی جھوم رہی ہے
دیدِ حُسن کی بیتابی ہیں   ساتھ نظر کے گھوم رہی ہے

جلوہ بے تابانہ لٹانا
اپنا وعدہ بھول نہ جانا

کوشش کو حاصل کی ہوس ہے   رہرو کو منزل کی ہوس ہے
نکہتِ گل کو صحن چمن کی   لیلی کو محمل کی ہوس ہے
دل کو ارمانوں کی تمنا   ارمانوں کو دل کی ہوس ہے
میں مرتا ہوں یاد میں تیری   بسمل کو قاتل کی ہوس ہے

میری بگڑی بات بنانا
اپنا وعدہ بھول نہ جانا

ظلمت کو پُر نور بنا دے   ہر ذرے کو طور بنا دے
حُسنِ دید کی دَولت دے کر   آنکھوں کو مغرور بنا دے
میری خلوت کی دنیا کو   ایک جہانِ نُور بنا دے
درد میں ڈوبے ہر منظر کو   ایک بہشتی حُور بنا دے

اس وادی کو آکے بسانا
اپنا وعدہ بھول نہ جانا

ہندوستان

خار و خس کی جھونپڑی، مٹی کے بوسیدہ مکاں
جیسے اندھوں کے اشارے، جیسے گونگوں کی زباں
جس طرح اترے ہوئے چہرے پہ آنسو کے نشاں
جس طرح سوکھی ہوئی ٹہنی پہ اجڑے آشیاں
داغ جن کے ساز و ساماں، درد جن کا پاسباں
کیا اسی دنیا میں تو پلتا ہے اے ہندوستاں

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب
جیسے گہری سوچ میں پچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب
جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

موت کی پرچھائیوں میں پلنے والی زندگی
آندھیوں سے تھما کر جلنے والی زندگی
ظلمتوں میں اپنی آنکھیں ملنے والی زندگی
تھام کر لغزش کا دامن چلنے والی زندگی
غم کے سانچے میں مسلسل ڈھلنے والی زندگی
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

ایک ارمانِ مسرت، ایک ارمانِ قرار
جیسے لب ہائے بیاباں سمندر کے کنارے جوئبار
جیسے ریگستان میں بھٹکی ہوئی موجِ بہار
جیسے وہموں کی پرستش، جیسے سایوں کا شکار
ارض پر جیسے فرشتے شہر میں جیسے گنوار
کیا یہی ہے اضطرابِ آرزوِ ہندوستاں

ایک آہِ نارسا بیگانۂ ذوقِ سخن — جیسے پہلی شام کو مہتاب کی مدھم کرن
جیسے اک اندھی کنواری کا ادھورا بانکپن — جیسے مرجھائی ہوئی کلیوں میں روداد چمن

جیسے اک سوئے ہوئے کافر کی ابرو میں شکن
کیا یہی ہے قوتِ فریاد اے ہندوستاں

اشنان

کہا ہے مجھ سے یہ تالاب کے کناروں نے — فضائے خلد سے آئی ہوئی بہاروں نے
کہ آج آئی تھی حسن و جمال کی دنیا — مرے شباب کی دیوی خیال کی دنیا
نہا کے بیٹھی تھی شانوں پہ بال بکھرائے — لطیف لہروں میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
سحر کے خواب میں تھی اک ادائے بیداری — فضا کو مست بناتی تھی ریشمی ساری
گھما رہی تھی کبھی چوڑیاں کلائی میں — سحر کا عکس جھلکتا تھا دلربائی میں
اٹھا کے چوم رہی تھی کبھی چنبیلی کو — کہ جیسے دل سے لگائے کوئی سہیلی کو
ہوا سے جسم کو سکڑا کے کپکپاتی تھی — شفق کو دیکھتی جاتی تھی گنگناتی تھی
مری نظر بہ نگاہوں سے دور بیٹھی تھی — حریم عرش کے دامن میں حور بیٹھی تھی

فلک کی آنکھ نے دیکھی ہے اسکی تنہائی
کہ جیسے دور سے سنتا ہو کوئی شہنائی

آپ بیتی

جان سی ہے بہاریں کرن میں — پھول آیا ہے آموں کے بن میں

کوکو ہر بار کہتی ہے کوئل — کھوئی کھوئی رہتی ہے کوئل
پی کہاں کہہ رہا ہے پپیہا — جس کا نغمہ سراسر تمنا
فاختے کی غم انگیز لے ہے — روحِ میکش کے ہونٹوں پہ مَے ہے
شاما منظر کو تڑپا رہی ہے — ہار سنگھار پہ گا رہی ہے
بے زبانی پہ فریاد آتی — پپیہے کے دکھ کی روداد آتی
ایک طوفان ہے نوجوانی — میری حالت ہے میری کہانی
جاگتا ہوں مگر سو گیا ہوں — خود سے میں بے خبر ہو گیا ہوں
آنکھ روتی ہے، دل میں کسک ہے — اشک میں حالِ دل کی جھلک ہے
دل پہ جو کچھ گزرتی ہے میرے — جس طرح ہوتے ہیں غم کے پھیرے
کہہ تو سکتا ہوں پر ہے زباں بند — من میں ہے پیت کی داستاں بند

رازِ الفت کو کیوں کر کہوں میں
خود پہ الزام کیسے دھروں میں

چاندنی رات

ویرانے سے بستی کی طرف بھاگ رہا ہوں — ہنگامۂ ہستی کی طرف بھاگ رہا ہوں
ہے خونِ عمل گرم رگِ کاہکشاں میں — اک برق ہے موجِ نگہ کون و مکاں میں
ہے پردہ درِ رازِ سکوں دیدۂ انجم — دریا کی ہر اک موج ہے بیتابِ تلاطم
ہے وقت کے ربط کا ہر اک ساز زمانہ — ہے چاند کی ہر ایک کرن دل کا فسانہ
ہنگامۂ گیتی میں نہاں رازِ عمل ہے — اندیشۂ انجام بھی آغازِ عمل ہے

ہر ذرے میں تنویرِ عمل دیکھ رہا ہوں
ہر خواب میں تعبیرِ عمل دیکھ رہا ہوں

ہر ایک قدم راہ بر راہِ بقا ہے
ہر ایک نفس میرے لئے بانگِ درا ہے

بیداریٔ دل لغزشِ اک گام نہیں ہے
پروازِ عمل، مرغِ تہہ دام نہیں ہے

اندھا

سُنتا ہے حُسنِ شمس و قمر دیکھتا نہیں
یعنی نظامِ شام و سحر دیکھتا نہیں

اسکے بھی پیرہن پہ گناہوں کے داغ ہیں
دنیا کو چاہتا ہے مگر دیکھتا نہیں

اس کو بھی ہیں نصیب محبّت کی لذتیں
دل تھامتا ہے، تیرِ نظر دیکھتا نہیں

اس کے بھی دل میں آگ بھڑکتی ہے عشق کی
جلتا ہے اور رقصِ شرر دیکھتا نہیں

اس کے بھی سر نے پایا ہے احساسِ بندگی
سجدے میں گر تو جاتا ہے در دیکھتا نہیں

اس کو سنبھال لیتی ہیں ہر بار ٹھوکریں
چلتا ہے اور راہ گزر دیکھتا نہیں

باتوں سے تاڑ لیتا ہے باطن کی خامیاں
ملتا ہے اور روئے بشر دیکھتا نہیں

ہنستا ہے صرف اپنے لئے، غیر پر نہیں
روتا ہے اور دامنِ تر دیکھتا نہیں

معلوم ہے تمول و غربت کی کشمکش
آنکھوں سے امتیازِ نظر دیکھتا نہیں

اس کو سکون چاہئے جینے کے واسطے
رہتا ہے اور اپنا ہی گھر دیکھتا نہیں

نعرۂ شباب

قرار بے قراریوں کا نام ہے شباب میں
سکونِ زیست پا رہا ہوں عہدِ اضطراب میں

عمل کے جام میں شرابِ علم پی رہا ہوں میں
کہ زندگی کو زندگی بنا کے جی رہا ہوں میں

نظر کی جستجو میں ہوں دلوں کی آرزو میں ہوں
نویدِ زیست جس میں ہے وہ خواہشِ نمو میں ہوں

حیات کی بہار ہوں شباب کی امنگ ہوں
میں غفلتوں کی موج کیلئے پیامِ جنگ ہوں

وجودِ چرخ جس پہ منحصر ہے وہ زمیں ہوں میں
مکاں جس پہ ناز کر رہا ہے وہ مکیں ہوں میں

مرا شباب زندگی ہے کائنات کے لئے
عمل کا گیت ہوں میں مطربِ حیات کے لئے

مری حریمِ آرزو میں یاس کا گزر نہیں
بہارِ بے خزاں ہوں میں خزاں کا مجھ کو ڈر نہیں

میں یادگارِ بود ہوں میں کائناتِ ہست ہوں
شراب پی نہیں کبھی کہ بے پئے ہی مست ہوں

رکاوٹیں ہیں ہر قدم پہ پھر بھی چل رہا ہوں میں
کہ ظلمتوں میں شمع نور بن کے جل رہا ہوں میں

دکن پہ مجھ کو ناز ہے دکن کے کام آؤں گا
کہ میں وطن پرست ہوں وطن کے کام آؤں گا

غزلیں

میری محجوبیت کو گرما کر ہنسے
برق سی ہونٹوں پہ لہرا کر ہنسے

ہنس کے دیکھا دیکھ کر تڑپا دیا
دیکھنے والے کو تڑپا کر ہنسے

کچھ تکلف سے گرائی برق بھی
جب ہنسی آئی تو شرما کر ہنسے

چاند کی کرنوں میں پھونکی روح سی
مستیاں منظر میں بکھرا کر ہنسے

ہیں خمارِ حسن میں انگڑائیاں
موجِ مے کی طرح بل کھا کر ہنسے

کھو دیا حسنِ تکلم میں مجھے
اپنے منہ سے پھول برسا کر ہنسے

دستِ نازک میرے شانے پر رکھا
بجلیاں رگ رگ میں دوڑا کر ہنسے

کہتے کہتے رک گئے کچھ جی کی بات — اپنے منھ تک ہاتھ لیجا کر ہنسے
رکتے رکتے مجھ سے وعدہ کر لیا — اپنے وعدہ پر قسم کھا کر ہنسے
ہنستے ہنستے رک گئے کچھ سوچ کر — وجہ جب پوچھی تو شرما کر ہنسے

میکشِ خاموش نے مانگی جو مئے
دور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

۲

شرابِ ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
چھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرِ مے میں — پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شرابِ نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں — کلامِ حافظ و خیام گنگنا کے پلا
ترا خیال ہے مجھ کو کبھی نہ بہکوں گا — تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا

کچھ امتیاز رہے میکدے میں میکش کا
لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

۳

ہم ہنسی میں ان کے صدمے سہہ گئے — ہنستے ہنستے قصۂ غم کہہ گئے
چند لمحے جو کٹے تھے ان کے ساتھ — وہ بھی دل کے داغ بنکر رہ گئے
زندگی ڈھونڈے گی ہم کو بعدِ مرگ — یہ بھی دیکھینگے جو جیتے رہ گئے
مار ڈالا آرزوئے موت نے — ایسی موت آئی کہ جی کر رہ گئے
اپنی اور ان کی تمناؤں کے راز — کچھ لبوں پر کچھ دلوں میں رہ گئے
اب سکونِ مرگ سے ہیں مضطرب — صدمۂ ہستی تو میکش سہہ گئے

۴

مری زندگی کی فطرت کا نظام ہے مجازی
کہ مری نیاز مندی میں ہے شانِ بے نیازی

مرے ہوش کو میسر ہے فقط خیالِ سجدہ
نہ خیالِ سرگرانی نہ خیالِ سرفرازی

مری بندگی کے چہرے پہ نہیں نقابِ تقوی
مرا ہر نفس عبادت، مری ہر نظر نمازی

مری لغزشِ جنوں سے کہیں چاک ہو نہ جائے
یہ لباسِ پارسائی، یہ نقابِ پاکبازی

میں چلوں تو اک قیامت میں رکوں تو اک قیامت
مرا ہر عمل حقیقت، مرا ہر سکوں مجازی

مرے دل کی دھڑکنوں کو وہ بنا رہے ہیں نغمہ
یہ ادائے دلبری او، یہ نگاہِ دلنوازی

ابھی ساغرِ تہی میں نہ شراب ڈال میکش
یہ گھٹا ابھی آسماں کی کہیں ہو نہ چالبازی

۵

بیزار ہو گئے ہیں بہار و خزاں سے ہم
اڑتے ہیں اب قفس کی طرف آشیاں سے ہم

قسمت نے اپنے ساتھ تھپک کر سلا دیا
کچھ چونکنے ہی والے تھے خوابِ گراں سے ہم

اپنے لئے کہیں بھی بسا لینگے اک جہاں
بچ جائیں گے جو کشمکشِ دو جہاں سے ہم

بندوں کو بندگی سے غرض ہے خطا معاف
سجدے ہی مانگنے ہیں ترے آستاں سے ہم

نقشِ قدم کو رہبرِ منزل بنا دیا
منزل کی جستجو میں چلے ہیں جہاں سے ہم

گم گشتگی میں منزلِ مقصود مل گئی
اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے کارواں سے ہم

اڑ جائیں گے چمن سے کبھی بن کے رنگ و بو
چھپ جائیں گے کہیں نگہِ باغباں سے ہم

وہ بھی زمیں پہ آتے ہی بے نور ہو گئے
تارے اڑا کے لائے تھے کچھ آسماں سے ہم

وہ آ رہا ہے میکشِ مخمور جھومتا
پوچھینگے میکدہ کا پتہ اس جواں سے ہم

۶

ڈرتے ڈرتے گناہ کرتا ہوں — تیری جانب نگاہ کرتا ہوں

عنفوانِ شباب کے صدقے — دل کی دنیا تباہ کرتا ہوں

یہ بھی کوئی گناہ ہے شاید — آج ترکِ گناہ کرتا ہوں

میری گستاخیاں معاف کہ میں — تیری محفل میں آہ کرتا ہوں

آج رہ رہ کے اپنے سجدوں کو — جانے کیوں فرشِ راہ کرتا ہوں

بات کھوتا ہوں التجا کر کے — التجائے نگاہ کرتا ہوں

لبِ فریاد بند ہے میکشؔ
ضبط کو صرفِ آہ کرتا ہوں

وجد۔ سکندر علی۔ بی۔ اے۔ ایچ سی ایس (عثمانیہ)

[ان کے رنگِ کلام کے لئے انکا تخلص بہت موزوں ہے۔ شاعرانہ نگاہ لطافتوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ رنگین اور رواں زبان ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دل حساس پایا ہے۔ قوم کی عظمتوں اور خرابیوں دونوں پر نظر ہے۔ جذبۂ حب وطن سے سرشار ہیں۔ نظم اور غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ غزل میں جذبات کی تازگی نمایاں ہے۔ خوش رنگی اور خوش نوائی ان کے حیات اور شعر کا ماحول ہے۔ "تاج محل" "علی ساگر" اور "اجنتہ" میں ان کے جوہر خیال خوب کھل رہے ہیں]

تاج محل

اے بارگاہِ حسن ترا فیض عام ہے — دریائے مہر و لطف رواں صبح و شام ہے
تو کشتۂ وفا کا سہانا پیام ہے — فانی زمیں پہ نقش بقائے دوام ہے
جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خواب قالبِ مرمر میں ڈھل گیا

بہزادِ عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ — منظر کشِ بہارِ چمن ہے جبینِ سنگ
کلیوں کا وہ نکھار، وہ گلہائے رنگ رنگ — فانوس شمع کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ
رنگینیاں ہیں جوہرِ اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

گلریز عکسِ خونِ دلِ حسن کار ہے — اس باغِ بے خزاں میں ہمیشہ بہار ہے

پانی پہ عکسِ قلب صفت بے قرار ہے
جمنا ترے شباب کی آئینہ دار ہے

ہیبت سے تیری دلکشیٔ بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

یہ زر دزرم دھوپ یہ ترکیبِ وقتِ شام
کندن بنے ہوئے درو دیوار و سقف و بام
خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام
وہ قلبِ شرق چیر کے نکلا مہِ تمام

جونہی رواں سفینۂ مہتاب ہوگیا
تو موج خیز قلزمِ سیماب ہوگیا

تو نقشِ آرزو ہے مجسّم زمین پر
آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی اس قدر
اک سرخوشی ہے قلب میں سرشار ہے نظر
بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بے خبر

ارزاں قدم قدم پہ سکونِ حیات ہے
تیری حریمِ ناز میں دن ہے نہ رات ہے

علی ساگر[۱]

علی ساگر میں بحرِ زندگانی موجزن دیکھا
تمنا کا گلستاں آرزوؤں کا چمن دیکھا
زمیں کے چپہ چپہ کو فلک پر خندہ زن دیکھا
دلِ شاعر تڑپ جاتا ہے ایسا بانکپن دیکھا

عیاں ہر موج سے ہے پیچ و خم جوشِ جوانی کا
دکھاتی ہے شعاعِ مہر منظر آگ پانی کا

فضا کی کیف باری اور مناظر کی فراوانی
یہ جھل کر بہ رہے ہیں سیم و زر اس رنگ کا پانی

۱؎ ضلع نظام آباد (دکن) کی ایک مشہور خوش منظر مصنوعی جھیل۔

یہاں فطرت سے چشمک کر رہی ہے عقلِ انسانی — پریشانی یہ ساحل کی ہے خود یابی کو حیرانی

مصائب لاکھ ہوں اہلِ بصیرت غم نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں تکلیف میں ماتم نہیں کرتے

نشے میں حسن کے سرشار ہے مدہوش ہے ساگر — لہکتا اک چمن ہے اور چمن بردوش ہے ساگر
پیامِ صبح سننے کو سراپا گوش ہے ساگر — سراسر جلوہ گاہِ نغمۂ خاموش ہے ساگر

عجب عالم ہے سیمائے سحر گویا پرافشاں ہے
پڑی ہے اوس وادی گوہرِ مقصد بداماں ہے

کس اہلِ دل نے یہ رحمت کا دریا کر دیا جاری — بہ قدرت ہمیشہ ہے یہاں مصروفِ گلکاری
عروسِ ماہ کے جلوے کی جب ہوتی ہے تیاری — شفق پانی میں حل کرتا ہے جھک کر چرخِ زنگاری

کنارِ آب دامِ موج یوں گلبار ہوتا ہے
گلے میں سبزِ ساحل کے گلوں کا ہار ہوتا ہے

شبِ مہتاب میں جنت نظر ہوتے ہیں نظارے — ہوا گلبن پہ دہکاتی ہے ہر جا لال انگارے
چمن میں پھول بنجاتی ہیں کلیاں جوش کے مارے — لٹاتے ہیں خوشی سے چاندنی حوضوں میں فوارے

محبت کے فرشتے گوش برآواز ہوتے ہیں
اس ارضِ پاک پر حسن اور نغمے مل کے بہتے ہیں

شبِ تاریک میں ہر ذرہ ہیبت بار ہوتا ہے — اجل کی گود گویا دامنِ کہسار ہوتا ہے
نظر کو آنکھ سے باہر نکلنا بار ہوتا ہے — "نفس سینے میں اک چلتی ہوئی تلوار ہوتا ہے"

سیہ پانی پہ موجیں مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں
گھٹائیں تلملاتی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں

تری خاکِ چمن کو میں نے پلکوں سے اٹھایا ہے — گل و ریحاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے
تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے — تری تعریف کا نغمہ تجھے پہروں سنایا ہے
مری آواز کی تجھ کو رہے گی آرزو برسوں
مجھے بھی اے علی ساگر! کرے گا یاد تو برسوں

کل رات کو

دور تھیں دل سے مآلِ اندیشیاں کل رات کو — کچھ نہ تھا اندیشۂ سود و زیاں کل رات کو
حسن کی موجوں کا طوفاں لے رہا تھا بار بار — عشق کی آغوش میں انگڑائیاں کل رات کو
وصل کے پُرکیف لمحے وقف تھے میرے لئے — تھا غمِ ہجراں نصیبِ دشمناں کل رات کو
اللہ اللہ زلفِ مشکیں کی وہ عنبر بیزیاں — میرا غم خانہ تھا رشکِ بوستاں کل رات کو
میں نہ دے سکتا تھا پُرمعنی نگاہوں کا جواب — بس جزاک اللہ اب تھا وردِ زباں کل رات کو
چھو لیا دستِ حنائی کو تو سارے جسم میں — خون کے بدلے رواں تھیں بجلیاں کل رات کو
گل پہ شبنم تھی کہ پیشانی پہ قطراتِ عرق — یا شفق پر ضوفشاں تھی کہکشاں کل رات کو
قرب اتنا تھا کہ آتی تھی دھڑکنے کی صدا — اُسکے دل پر اپنے دل کا تھا گماں کل رات کو
حسن محوِ عشق تھا، اور عشق غرقِ حسن تھا — تھا من و تو کا نہ جھگڑا درمیاں کل رات کو

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں — جہاں گُھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں — جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہر شان جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں
پیام زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
فضائیں گونجتی رہتی ہیں ہر دم دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیات جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
متکلم ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی

گلستان اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دست جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصل بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا
سکھایا گر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دل کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیاد جہان جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے

اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز، اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا — قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جیئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش اِن کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

ترے بغیر

ہے بے سرور محفلِ رنداں ترے بغیر — سونی پڑی ہے بزمِ حسیناں ترے بغیر
بادِ بہار میں ہیں خزاں کی حرارتیں — صحنِ چمن ہے گوشۂ زنداں ترے بغیر
تو پاس تھا تو سنبل و ریحاں تھے خار و خس — اب خار و خس ہیں سنبل و ریحاں ترے بغیر
جامِ شراب زہرِ ہلاہل سے کم نہیں — ٹھکرا رہا ہے ابرِ خراماں ترے بغیر
تاریک ہیں وہ جانِ طرب نور باریاں — ڈستی ہے اب تو شمعِ شبستاں ترے بغیر
موجودگی میں تیری جہاں پر سکون تھا — عقل و جنوں ہیں دست و گریباں ترے بغیر

پھرتا ہوں دل میں درد کی دنیا لئے ہوئے ملتا نہیں ہے درد کا درماں ترے بغیر

دل کی طرف ہے پھر نگہِ التفاتِ غم ہے دستِ یاس سلسلہ جنباں ترے بغیر

خواب و خیال ہو گئیں سب گلفشانیاں

چپ سی لگی ہے وجد کو اے جاں ترے بغیر

عبدالرزاق لاری

باقی کوئی سلطاں کا ہوا خواہ نہیں ہے ہے کون جو انجام سے آگاہ نہیں ہے

دل کس کا اسیرِ کششِ جاہ نہیں ہے لاری ہی اکیلا ہے جو گمراہ نہیں ہے

غصّے میں رخِ تیغ دو دم چوم رہا ہے

خادم درِ آقا پہ کھڑا جھوم رہا ہے

لڑنے لگے خونخوار مغل قلعہ کے در پر تیغوں کی چمک سے ہیں در و بام منوّر

کس شیر کی ہمت سے پریشان ہے لشکر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا فوجِ عدو پر

یہ ہاتھ ہے یا دستِ اجل طالبِ جاں ہے

قبضے میں ترے تیغ ہے یا برقِ تپاں ہے

بجلی سرِ اعدا پہ تڑپتی ہے مسلسل عمروں کے تعین کئے ہیں پیمانے گھڑی پل

لاشوں کے ہیں انبار زمیں خوں سے جل تھل ہیبت سے پڑی ہے تری افواج میں ہلچل

جس سمت پھر اشور اٹھا "جن بچہ آمد"

ہنگامِ وغا نیست قضا پیش نحر آمد!!"

ملبوس ترا خون سے گلنار ہوا ہے
ہر عضوِ بدن زخم سے بیکار ہوا ہے

یہ ضعف ہے سر تن پہ گراں بار ہوا ہے
قد خون میں ڈوبی ہوی تلوار ہوا ہے

لے جاتے ہیں گو تجھکو شہنشاہ کی جانب
نظریں ہیں تری تختِ قطب شاہ کی جانب

اقبال کا ساتھی ہے پدر ہو کہ برادر
ادبار میں تسکیں نہیں دیتا کوئی دم بھر

اس معرکۂ دہر میں ہوتا ہے یہ اکثر
قسمت کے بدلتے ہی بدل جاتے ہیں تیور

پر عہدِ وفا تو نے مصیبت میں نہ توڑا
جب تک رہی طاقت درِ آقا کو نہ چھوڑا

مشکل میں گوارا نہ کیا غیر کا احساں
ٹھکرا دیا یہ کہہ کے شہنشاہ کا فرماں

"مفتوحِ بد اختر کی امانت ہیں دل و جاں
میں ملک ہوں مالک کی ہی ہے مرا ایماں

روکے سے مرا جوشِ وفا رک نہیں سکتا
گردن مری کٹ سکتی ہے سر جھک نہیں سکتا!"

شمشیرِ دکن! تو نے عجب دھاک بٹھا دی
دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھا دی

اے مردِ خدا قدرِ وفا تو نے بڑھا دی
قرباں ترے مالک کے لئے جان لڑا دی

جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہیگا
تاریخ دلیراں میں ترا نام رہیگا

شباب و خواب کی دنیا

یہاں اکثر سنے تھے حسن کے رازِ نہاں میں نے
یہاں پہروں کہی تھی دردِ دل کی داستاں میں نے

یہاں ڈھونڈا تھا سجدوں کیلئے اک آستاں میں نے
یہاں پائی تھی آخر اک بہشتِ جسم و جاں میں نے

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

وہ آجاتا تو شب رشکِ سحر معلوم ہوتی تھی ہر اک شے حسن سے جنت نظر معلوم ہوتی تھی
جوانی کی نظر صہبا اثر معلوم ہوتی تھی خوشی میں زندگانی مختصر معلوم ہوتی تھی

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

بھری برسات میں پچھلے پہر گھر کر سحاب آتا بہاریں ٹوٹ پڑتیں ذرہ ذرہ پر شباب آتا
جنوں کا زور ہوتا دور میں جام شراب آتا مثالِ موجِ مے ساقی کے چہرے پر حجاب آتا

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

بہارِ کیف و مستی لے کے آتی چاندنی راتیں محبت رنگ لاتی اور بڑھ جاتی ملاقاتیں
بیاں کرتے تھے دونوں حسن و الفت کی کراماتیں اسی میں رات کٹتی ختم ہی ہوتی نہ تھیں باتیں

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

محبت کے نشے میں حسن کا دریا بہاتے تھے مجھی کو ابتدائے عشق کا قصہ سناتے تھے
کہیں میں مسکرا دیتا تو فوراً روٹھ جاتے تھے منانے پر مرے، رخ پھیر کر کچھ گنگناتے تھے

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

کبھی قبل سحر پورا نہ ہوتا میرا افسانہ جھکولے نیند کی موجوں میں کھاتی جانِ میخانہ
نشے میں شمع بنتی زینتِ آغوشِ پروانہ یونہی اکثر چمکتی رات بھر تقدیر غم خانہ

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

اندھیری رات میں اُن کا چلا آنا قیامت تھا مری حیرت پہ ہنس کر پھول برسانا قیامت تھا
صدائے جنبشِ داماں سے گھبرانا قیامت تھا سحر کے نور میں ہنس کر سما جانا قیامت تھا

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

غزلیں

حریمِ عشق کے قابل بنا دیا تو نے
روئیں روئیں کو مرے دل بنا دیا تو نے

یہ سب قصور ہے اے قیس کم نگاہی کا
نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے

ہر ایک کامل ناقص کو رشک ہے مجھ پر
خوشا! کہ ناقصِ کامل بنا دیا تو نے

سفینہ ڈوب چکا اب سکون ہے اے طوفاں!
بھنور کو دامنِ ساحل بنا دیا تو نے

بچاؤ اپنے نشیمن کا وحؔید خوب کیا
کہ بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

۲

کہاں تھی مجھ میں سکت زور آزمانے کی
اٹھائیں عشق نے سب سختیاں زمانے کی

مری نظر نے کیا کام گدگدانے کا
نگاہِ ناز تھی تمہید مسکرانے کی

ادائے خاص سے اک بار کوند اے بجلی!
جھک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی

مآلِ جذبۂ تکمیل آج تک نہ کھلا
عجیب چیز تھی دھن آشیاں بنانے کی

رہے گا وحؔید بیاں عشق کا سدا ایکن
بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

۳

رہرو راہِ محبت کی کوئی منزل نہیں
زندگی کا عشق حاصل عشق کا حاصل نہیں

چشمِ ساحل آشنا! تجھ سا کوئی غافل نہیں
دیکھ! طوفانِ اجل کی موج ہے ساحل نہیں

ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل
اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں

قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحاں گاہِ کمال
بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

شعر کے پردے میں رازِ زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا وجد میں قائل نہیں

۴

ترے سوا اے جہانِ الفت کلام بھاتا نہیں کسی کا
تجھے یقیں آئے یا نہ آئے یہ راز ہے میری خامشی کا

چمن میں گر میری لے میں بلبل بیاں کرے درد اپنے جی کا
گلوں کے دامن ہوں پرزے پرزے تو خون ہو دل کلی کلی کا

ہر ایک نقشِ قدم پہ صد ہا نشانِ سجدہ بنے ہوئے ہیں
مری جبیں سائیوں پہ شاہد ہے ذرہ ذرہ تری گلی کا

ترا تکلم بہار ساماں ہے جس پہ بلبل بھی پاک داماں
ترے تبسم پہ لوٹ کلیاں، گلوں میں چرچا تری ہنسی کا

چمک رہا ہے مرا مقدر، بھلا عدو کو کہاں میسر
وہ جلوۂ خاص جس کے رخ پر، نقاب کھلتا ہے بزمی کا

کوئی جو قدموں پہ گر پڑا ہو تو ہنس کے کوئی اٹھا رہا ہو
ہمارے مذہب میں صرف زاہد یہی تصور ہے بندگی کا

فضول ہے وجد پند تیری خدا سے دل کر گیا دلیری
بجائے تکبیر آج میری زباں پہ نام آگیا کسی کا

۵

یقین مان! جادو بیانی نہیں ہے
یہ بیتا ہے ظالم کہانی نہیں ہے

گلوں کی طرح بلبلیں بھی جدا ہیں
کوئی عاشقوں کی نشانی نہیں ہے

ذرا اشک للہ پلکوں پہ تھم جا
مجھے تیری قیمت گرانی نہیں ہے

سراسر خطا تھی نگاہِ تمنا
گنہ گار تیری جوانی نہیں ہے

دل و جاں تری طرزِ پرسش کے صدقے
مجھے تجھ سے کچھ بدگمانی نہیں ہے

قفس ہے یہ اے زورِ بازو قفس ہے!
یہاں رخصتِ پرفشانی نہیں ہے

مروت گراں ہے، محبت گراں ہے
یہاں دوستوں کی گرانی نہیں ہے

لطیف النسا بیگم ایم، اے (عثمانیہ)

[جامعہ کی ذہین اور علم پرست شاعرہ ہیں۔ ذوقِ شاعری صاف ستھرا پایا ہے۔ تعلیم کی روشنی میں انھوں نے نسوانی دنیا کی تہذیبی خرابیاں، ایک درد بھرے دل کے ساتھ دیکھی ہیں اور اسی درد کے ساتھ کبھی شعر کی زبان سے اپنی داستان سناتی ہیں۔ ان کا دوسرا مشرب بچوں کے لیے سادہ نظمیں لکھنا ہے۔ جہاں یہ کسی خاص آرٹ کے ساتھ کسی موضوع پر نظم لکھتی ہیں وہاں بچے کی زبان میں "ماں" کا دل بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "تاروں کا مدرسہ" اس موضوع کا اچھا نمونہ ہے۔ غزل میں بھی تسلسل خیال آجاتا ہے جو ان کے احساس قلبی کا مظہر ہے]

کیسا اچھا خالق ہے تو

سب کی حالت دیکھنے والے — سب کی باتیں سننے والے
سب کو پیدا کرنے والے — سب کو روٹی دینے والے

مالک ہے تو رازق ہے تو
کیسا اچھا خالق ہے تو

تو نے انساں ہم کو بنایا — شکر کریں کیا تیرا مولا
شب بھر میٹھی نیند سُلایا — صبح کو خوش بستر سے اُٹھایا
مالک ہے تو رازق ہے تو — کیسا اچھا خالق ہے تو

علم عطا کر ہم کو یارب — عقل عطا کر ہم کو یارب
نیک بنا کر ہم کو یارب — جگ میں بڑا کر ہم کو یارب
مالک ہے تو رازق ہے تو — کیسا اچھا خالق ہے تو

ہم کو بنا دے اچھے بچے — کام سکھا دے اچھے اچھے
دُور برائی کو رکھ ہم سے — سُن لے میری مولا میرے
مالک ہے تو رازق ہے تو — کیسا اچھا خالق ہے تو
اپنے شہزادے ہیں مجیدی — دے تو طینت ان کو اچھی
علم و ہنر اور عقل و نیکی — اُن پہ لگی ہیں آنکھیں سب کی
مالک ہے تو رازق ہے تو — کیسا اچھا خالق ہے تو

زمانہ بدل گیا

پہنچا نگار خانہ معنیٰ میں جب خیال — فکر سخن میں سر بگریباں کیے ہوئے
دیکھا کہ تھا وہاں نہ تماشائے رنگ و بو — سامان صد ہزار گلستاں کیے ہوئے
حیرت میں تھا مذاقِ سخن گو کہ کیا ہوا — اٹھا ہے کون بزم کو ویراں کیے ہوئے
موجود ہے نہ رنگِ تغزل نہ کیفِ حُسن — رکھتا ہو جو ہوس کو پریشاں کیے ہوئے
کیا ہو گئے وہ حسن و تعشق کے تذکرے — پروانہ و چراغ کا ساماں کیے ہوئے
نازک خیالیاں وہ ہوئیں کیا جو رکھتی تھیں — بادِ سحر کو مروجہ جنباں کیے ہوئے
کیوں دوڑتا نہیں ہے گل و لالہ پر خیال — طرف چمن کی سیر کا ساماں کیے ہوئے
آشفتگی وہ دشت نوردوں کی کیا ہوئی — دل کو رہین چاک گریباں کیے ہوئے
آیا جواب دل سے زمانہ بدل گیا — اسلوب رنگِ نو کو نمایاں کیے ہوئے
ملّت کا درد دل میں نہ ہو جن کے بس وہی — بیٹھے ہیں حسن و عشق کا ساماں کیے ہوئے
دنیا عمل سے چلتی ہے بیٹھے ہیں ایک ہم — آزادیٔ خیال کا ساماں کیے ہوئے

سلام

السّلام اے نورِ عین رحمت اللعالمین
السّلام اے راحت جان امیر المومنین

اے حسینؑ ابن علیؑ ایمان کی تو جان ہے
تیرے جد کی شان میں لولاک کا فرمان ہے

باپ وہ جس کی فرشتوں نے ثنا کی بار بار
لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

ماںؑ وہ کی تعظیم جس کی خود نبی نے بارہا
بضعۃ منّی کہا جس کو پیمبر نے سدا

پلنے والے گودیوں میں احمدؐ مختار کی
چوسنے والے زباں کو مخبر اسرار کی

واہ کیا کہنا ترا اے راکب دوش نبی
تو نے دی تاثیر دکھلا فاطمہؑ کے شیر کی

حشر تک باقی رہا اسلام پر احساں تیرا
کارنامہ نے تیرے تاریخ کو چمکا دیا

ٹوٹتا ہے کفر کیونکر تو نے بتلایا ہمیں
کس طرح مرتے ہیں حق پر تو نے دکھلایا ہمیں

رجس سے ہے دور تو وہ پیکر تنویر ہے
جس پہ قدرت نے قلم توڑے تو وہ تصویر ہے

تو نے عالم کو دکھا دی شان ضبط و اختیار
گود میں اصغر کی میت لب پہ شکر کردگار

محو حیرت ہے زمانہ تیری ہمت دیکھ کر
شکر کے سجدے کیے کڑیل جواں کی لاش پر

لذت ایذا رسانی سے عدو بھی جھک گئے
تو مصائب سے نہیں تجھ سے مصائب تھک گئے

اے رضا جوئے خدا تیری رضا حق کی رضا
اے سراپا سرِّ نفسِ مطمئنہ مرحبا

قرب حق منزل تری ہے مرحلہ تیرا عظیم
تیرا پیرو جادہ پیمائے صراط مستقیم

ہمت عالی نے تیری لے لیا کونین کو
کفر سمجھا راہ حق میں ترکِ نصب العین کو

گلزارِ رنگ و بو

بہار آئی کھلا ہے ہر طرف گلزارِ رنگ و بو — پپیہا کی کہیں "پی پی" ہے کوئل کی کہیں "کو کو"
گل و بلبل میں پھر ہونے لگیں سرگوشیاں باہم — صنوبر پر صدا قمری کی پھر آنے لگی "یا ہو"
ہوا تخئیلِ قدرت پھر اسیرِ ذوقِ آرائش — مبارک شاہدِ حق کے سنورنے پھر لگے گیسو
پتہ ملنے لگا اس بے نشاں کا پتہ پتہ سے — ہے جس کا رنگ گلشن میں گلوں میں جسکی ہے خوشبو
لیے جام و سبو پھر ساقیٔ مستِ شباب آیا — بلند ہونے لگی مستوں کی میخانے سے پھر "ہا ہو"
تماشا دیدنی ہے گرچہ ہمدم صحنِ گلشن کا — نہیں ہر اک کو دنیا میں دماغ سیرِ آبِ جو
ہنسی آتی ہے یاں زندہ دلوں کو نوحۂ غم پر — مبارک باد پر مردہ دلوں کے بہتے ہیں آنسو
ہزاروں مرتبہ دیکھا بدلتے رنگ گلشن کو — نہ بدلی پر نہ بدلی بلبلِ شوریدہ سر کی خو
نظر آتی ہیں رنگا رنگیاں کیا کیا نہ گھر بیٹھے — ذرا سے دل میں ہے آباد اک دنیائے رنگ و بو
حقیقت میں نہیں ہے فرقِ وحدت اور کثرت کا — نگاہیں پڑتی ہیں جس جا نظر آتا ہے تو ہی تو
ہمارا ظرفِ خودداری نہ چھلکا ہے نہ چھلکیگا — مبارک زاہدانِ خود نما کو وردِ "اللہ ہو"

تاروں کا مدرسہ

فلک پر جو تارے ہیں یہ جگمگاتے — کہاں سارا دن امّی جاں ہیں یہ جاتے؟
ہے شاید کوئی مدرسہ ان کا امّی — اندھیرے ہی سے جسکی بجتی ہے گھنٹی
بہت ہی سویرے سے تیار ہو کر — یہ سب وقت پر جاکے ہوتے ہیں حاضر
وہیں ہونگے دن بھر یہ سب لکھتے پڑھتے — حساب اور قواعد بھی ہونگے یہ کرتے

وہ تارا کتنا ہیں بڑی ہوگا پڑھنا
یہ ننھا سا پڑھتا الف، بے، تے ہوگا

بہت دور گھر سے یہ بیچارے دن بھر
پڑے رہتے ہونگے جماعت کے اندر

بڑے ہونگے استاد ان کے غصیلے
جگہ سے سرکنے بھی ہونگے نہ دیتے

جو ہوگا کوئی بھی ذرا جھانک لیتا
تو کونے میں ہوگا کھڑا ہونا پڑتا

یہ تاروں کا ہے مدرسہ کیسا امّی
بڑی دیر سے اس کو ہوتی ہے چھٹی

نظر آتے ہیں بعد مغرب کے تارے
نہیں دیکھتے ماں کو دن بھر بچارے

ترس ان پہ آتا ہے امّی مجھے تو
اندھیرے میں آتے ہیں بیچارے گھر کو

غزلیات

حقیقت کیا ہے پہنائے جہاں کی
ہیں دل ہیں وسعتیں کون و مکاں کی

ہر اک ذرّہ سے آتی ہے صدا یہ
نشانی ہے یہیں اس بے نشاں کی

نڈر ہوں جو ازل سے ان کو کیونکر
ڈرائینگی جفائیں آسماں کی

ہے پستی طائر ہمّت کی ورنہ
ضرورت کب ہے اس کو آشیاں کی

ہوئی فکر رسا مائل بہ پرواز
خبر لائیگی جا کر لامکاں کی

نہ ہو جبرئیل کی جس جا رسائی
بشر کیا کر سکے جراءت وہاں کی

ہوا تخلیق جب نور محمدؐ
کھلی قسمت زمین و آسماں کی

۲

دشمن جاں چرخ نیلی فام ہے ہر طرف پھیلا حسد کا دام ہے

عشق نافرجام کا انجام ہے کوبکو بیمار غم بدنام ہے

چھوڑ دے حرص و ہوس کو مفت کیوں پائمال حسرت ناکام ہے

شدت غم سے ہوا دل آب آب سوزش پیہم کا یہ انجام ہے

تجھ سے نا اہلوں کو بھی دنیا ملے یہ دلِ ناداں خیال خام ہے

زندگی کہتے ہیں جس کو ہم نشیں اضطرابِ متصل کا نام ہے

اہلِ ظاہر موت کہتے ہیں جسے اک سکون قلب ہے آرام ہے

فائدہ اس ورد سے ہو یا ضرر نام جپنا اس کا اپنا کام ہے

ہچکیاں لیتا ہے اب بیمار غم
زندگی لبریز تیرا جام ہے

۳

وہ عین شاہد و اصل شہود باقی ہے اسی کے دم سے یہ سب ہست و بود باقی ہے

سراب دہر میں کاغذ کی ناؤ چلتی ہے عبث سفینۂ اہل سجود باقی ہے

ہزاروں ہوگئے آآکے کارواں راہی صدائے متصل رفت و بود باقی ہے

جہاں کے صفحۂ تاریخ پر بہ حرف جلی بس ایک تذکرۂ اہل جود باقی ہے

اشارہ نزع میں ہے نیم باز آنکھوں کا خمار محفلِ عیش و سرود باقی ہے

کبھی تھا ہم کو بھی ارمان کامرانی کا پر اب تو فکر زیاں اور نہ سود باقی ہے

اگرچہ خرمنِ امید لٹ چکا اپنا
یہ سوزشِ دلِ اہلِ حسود باقی ہے

—— ۴ ——

تپ سوزِ غم سے جلا چاہتی ہوں گناہوں کی اپنے سزا چاہتی ہوں
زمانے سے کھویا اسی چاہنے نے میں اب کیا بتاؤں کہ کیا چاہتی ہوں
مِرا ساری دنیا بُرا چاہتی ہے میں سارے جہاں کا بھلا چاہتی ہوں
مصیبت ہو راحت ہو غم ہو کہ شادی میں تیری رضا کبریا چاہتی ہوں
بڑی خود غرض ہوں بڑی مطلبی ہوں بُرائی کا بدلہ بھلا چاہتی ہوں
سدا اپنے دشمن کو بھی دوست جانا بڑی ناسمجھ ہوں سزا چاہتی ہوں
کیا قتل دنیا کی ناقدریوں نے میں تجھ سے مِرا خوں بہا چاہتی ہوں
ہوئی زندگی تلخ ہاتھوں سے جس کے اُسی کا بھلا میں سدا چاہتی ہوں

رباعیات

ہستی سے ہے معمور زمانہ کب سے چلتا ہے جہاں کا کارخانہ کب سے
حیراں ہوں کہ کیوں ختم نہیں ہوتا ہے ہے صرف میں قدرت کا خزانہ کب سے

اونچی ہے ہر اک اوج سے پستی اپنی افلاک کے اُس پار ہے بستی اپنی
دنیا نے بہت ہم کو ستایا لیکن اتری، ان ترشیوں سے مستی اپنی

دنیا کی محبت میں اسیری دیکھی اسباب امارت میں فقیری دیکھی
سیکھی ہے مرے دل نے قناعت جب سے بے مائگی میں شانِ امیری دیکھی

نوشابہ ۔ نوشابہ خاتون بی۔اے (عثمانیہ)

[حساس دل رکھتی ہیں فیشن پرستی اور تہذیب جدید کی تباہ کاریوں پر آنسو بہاتی ہیں ۔ کبھی اپنا دردِ دل بھی سنائے بغیر نہیں رہتیں ۔ جب دل اکتا جاتا ہے تو مناظر قدرت کی طرف آنکھ اٹھاتی ہیں ۔ زندگی ان کے نزدیک ایک نغمہ اور سرود حیات ایک آہ دل سوز ہے ۔ کلام میں سادگی اور حلاوت ہے ۔ گاہ گاہ ہلکے طنز سے بھی کام لیتی ہیں ۔ نظم کے لیے نئے سانچوں کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔ غزل بہت کم کہتی ہیں ۔ یادالہٰی میں ان کے دن گذرتے ہیں ۔]

نغمۂ حیات

ہے نوائے تلخ یارب سوز و سازِ زندگی
نغمۂ شیریں سنا بربطِ نوازِ زندگی

منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا
آشکارا ہوگیا دم بھر میں رازِ زندگی

ہے حجابِ زیست اک پردہ دوئی کا پھر بھی
جستجو طولِ امل کی، بے نیازِ زندگی

اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن
شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گدازِ زندگی

ہے سکونِ موت سے بدتر سکونِ بےحسی
سعی و حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی

انبساطِ رُوح ہے سرگرمیٔ ذوقِ عمل
دل کی حرکت جس طرح ہے جاں نوازِ زندگی

اعتمادِ نفس، استقلال و ایثار و کرم
عرصۂ فانی میں ہے اعلیٰ طرازِ زندگی

خسروِ خاور

شق ہونے لگا ہے پردۂ شب، اب خسروِ خاور آتا ہے
ہے رُخ پہ مقنع کرنوں کا، وہ مہرِ منور آتا ہے
کیا دوش پہ ڈالے سرتاسر، وہ نور کی چادر آتا ہے

بو رنگِ سحر بھی کھلنے لگا، ظلمات کا بادل چھٹنے لگا
دامانِ شفق جو سمٹنے لگا خورشید نقاب الٹنے لگا

کیا جلوہ گری صناعِ ازل نے مہرِ فلک کو بخشی ہے
مرہونِ کرم ہر تارِ نفس، شرمندۂ احساں ہستی ہے
آباد اشارے سے جس کے، دنیا کی یہ ساری بستی ہے

یہ سارے کرشمے اس کے ہیں جو خالق ہے جگ داتا ہے
جو سندر سندر روپ نئے، ہر آن ہمیں دکھلاتا ہے

ہے دل میں تڑپ تیری ہی فقط، آنکھوں میں ہے جلوہ تیرا ہی
ہر شے میں عالم ہستی کی دیکھا ہے کرشمہ تیرا ہی
سرگرم سپاس و محو ثنا ہے ذرّہ ذرّہ تیرا ہی

عاجز ہے عقلِ فلسفہ داں، اور سائنس بھی محوِ حیرت ہے
کیا حکمت سبحان اللہ ہے، کیا صنعت ہے کیا قدرت ہے

لیکن اے پجاری سورج کے، کر خیرہ نہ اپنی بصیرت کو
مت بھول بصارت پر اپنی، یوں دیکھ کے ظاہر صورت کو

کر غور فیوضِ قدرت پر، کر، سجدے، خالق قدرت کو

جب سینہ کوہ کا تپتا ہے، الماس و لعل اگلتا ہے

پتھر سے جواہر بنتا ہے، نیلم پکھراج نکلتا ہے

تیار ہیں غلے کھیتوں میں، سورج تو گلخنِ قدرت ہے

شاداب ہے گلشن ہستی کا، خورشید سحابِ رحمت ہے

اے مظہرِ صنعت یزدانی، تو صفحۂ دہر کی زینت ہے

ہے وجہ نمود رنگ جہاں، تزئین باغ ہستی ہے

نوشابہ اگر سچ پوچھو تو، سورج ہی چراغِ ہستی ہے

فریاد بجناب باری

دل بھی ضعیف اور جگر بھی ضعیف ہے — اور چور چور درد سے جسم نحیف ہے

اس درد دل کی دور اذیت نہیں ہوئی

کوئی دفع غرض کہ مصیبت نہیں ہوئی

افسوس ہے بحال طبیعت نہیں ہوئی

اک جسم زار، اور ہیں آزار بیسیوں — ہے جان ایک دشمنِ خونخوار بیسیوں

باقی نہیں علاج میں کچھ بھی رہا اثر

دکھلاتی زہر کا ہے الٰہی دوا اثر

آب و ہوا بدلنے سے الٹا ہوا اثر

چلتے عمل ہیں مجھ پہ جو، وہ دشمنوں کے ہیں — کاری جو وار لگتے ہیں بدباطنوں کے ہیں

ہے لطف زندگی کا نہ موت اختیار میں
باقی نہ اب سکون رہا قلبِ زار میں
انفاس کٹ رہے ہیں، مرے اضطرار میں
مردہ بہ شکل زندہ ہوں پژمردۂ الم — بیمار دردمند ہوں، افسردۂ الم

کب تک تڑپ تڑپ کے الٰہی جیا کروں؟
کب تک میں ہائے ہائے الٰہی کیا کروں؟
تو بھی اگر خفا ہو تو کس سے دعا کروں؟
تیری زمین، تیرا ہی یہ آسمان ہے — یہ جسم زار تیرا ہی، تیری ہی جان ہے

تو مجھ کو چھوڑ دے تو سنے کون التجا
کس کو سناؤں، تو بھی اگر مجھ سے ہو خفا
تیرے سوا تلاش کروں کس کا آسرا
فرما مدد، کہ حال مرا اب سقیم ہے — بیمار تن ہے غم سے، مرا دل دو نیم ہے

ملا شاہی باغ کا منظر

(سری نگر، کشمیر میں)

اڑ در ابر کوہ سے، ہونے لگا گہر فشاں — چوٹی بھی کس شکوہ سے، بادلوں سے ہے ہمعناں
دامنِ کوہسار سبز — وادی و شاخسار سبز
آتی ہے جو بہار سبز — سارے ہیں برگ و بار سبز

فرشِ زمین زمردیں، نیلگوں چترِ آسماں　　موج ہوا ہے عنبریں، قطعہ ہے سارا بوستاں
قلعۂ کوہسار برف　　منظر پر بہار برف
کیوں نہ ہو آبدار برف　　یاں ہے گہر نثار برف
قدرتِ کردگار ہے، ذرۂ خاک سے عیاں　　ظاہر و آشکار ہے، شانِ خدائے دو جہاں
باغ و راغ گل بدوش　　قوتِ نامیہ بجوش
ساری زمین سبز پوش　　دامنِ کوہ گل فروش
رنگ شفق ہے لالہ گوں، چرخ کا دل ہوا ہے خوں　　نور سپہر ہے فزوں، چادر آب سیم گوں
باندھے ہوئے ہیں صف دیار　　سرو کہیں، کہیں چنار
بیر کہیں ہیں سایہ دار　　سیب کہیں، کہیں انار
تازگی بخش ہے فضا، اور سماں نشاطِ روح　　موج ہوا وہ دلفزا، جس سے ہوا نبساطِ روح
نغمہ سرا ہیں یاں ہزار　　گونج رہے ہیں سبزہ زار
جھوم رہے ہیں شاخسار　　مست ہیں سارے جاندار
نقرئی جوئبار ہے، سیمگوں آبشار ہے　　منظر پر بہار ہے، رحمتِ کردگار ہے
نکہتِ گل ہے عطر بار　　دشت و جبل ہیں لالہ زار
وَرْد و سمن کی ہے بہار　　قدرتِ حق ہے آشکار
روح فزا نسیم ہے، پھیلی ہوئی شمیم ہے　　فضلِ خدا عمیم ہے، خطہ یہی نعیم ہے

شکوۂ دل پی لیا

نوشدارو کی طلب میں زہر قاتل پی لیا
اپنے ہاتھوں ہی سے خونِ حسرت دل پی لیا
پھونک ڈالے جُرعہ خوشرنگ نے قلب و جگر
جس طرح پھولوں نے ہو، خون عنادل پی لیا
دفترِ بے معنیٔ الفت ہوا غرقِ شراب
تو نے ساقی اپنا وہ پیمانِ باطل پی لیا
ورطۂ بحرِ ہلاکت سے ملے کیونکر نجات
تو نے کیا اے تشنہ کامِ ذوقِ ساحل پی لیا؟
رُوح فرسا ہو چکی ہے، تلخیٔ صہبائے غم
ہم نے سرشاری میں، خمخانہ ہی کا کل پی لیا
رنج و غم کھاتے رہے، پیتے رہے خونِ جگر
کیسا یارائے شکایت، شکوۂ دل پی لیا

غزل

وہ خدا ہے، خدا کا کیا کہنا — اس کی حمد و ثنا کا کیا کہنا
آرزوئے وفا نہ خوفِ جفا — دل بے مدّعا کا کیا کہنا

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا آپ کی اعتنا کا کیا کہنا
طاقتِ ضبط ہے نہ تابِ فغاں دلِ درد آشنا کا کیا کہنا
نت نئے روز گل کھلاتی ہے واہ بادِ صبا کا کیا کہنا
کشتیاں چلتی ہیں ہواؤں پر اپنے ذہنِ رسا کا کیا کہنا
بجلیاں دشمنوں کے دل پہ گریں میری آہِ رسا کا کیا کہنا
نہ ہماری سنی، نہ اپنی کہی
عارفانِ فنا کا کیا کہنا